اُڑتے ہوئے خاکے

سیّد ضمیر جعفری

اڑتے ہوئے خاکے

سید ضمیر جعفری

قیمت فی نسخہ : روپے

طباعت: از [illegible] پریس لاہور بہ اہتمام علاء الدین مظہر
مجلسِ اردو۔ اردو بازار لاہور۔

اشاعت: از ایم۔جی ماڈل ٹاؤن۔لاہور۔

اُڑتے
ہُوئے
خاکے

سیّد ضمیر جعفری

مجلسِ اُردو۔ کتاب خانہ حفیظ۔ اُردو بازار، لاہور

ترتیب

امتنان و احتشام

کے

نام

ضمیر خود ضمیر کی نظر میں

ریڈیو پاکستان (راولپنڈی) نے مجھے اپنے
ماحول، فنی مراحل اور فکری مسائل یعنی —
"ذات، حالات، بات" — وغیرہ کے بارے
میں اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ یہ مضمون
اس فرمائش کی تعمیل میں لکھا گیا تھا۔
میں نے سوچا خاکوں کے اس مجموعہ کی ابتدا
خود اپنے خاکے سے کیوں نہ کروں؟۔

(ض۔ ج)

ضمیر جعفری اور میں ہم۔ دونوں ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے ایک ساتھ پلے بڑھے اور زندگی میں داخل ہوئے۔ زندگی ہی نہیں اس کے محسوسات کا بھی ایک ایک لمحہ میرے سامنے ہے!

ضمیر ضلع جہلم کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نیلی نیلی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک وادی میں واقع ہے۔ دریائے جہلم جب پہاڑوں سے اُتر کر میدانوں میں داخل ہوتا ہے تو اس وادی سے گذرتا ہے۔ ضمیر کا سارا بچپن اور نوجوانی کا بڑا حصہ اسی گاؤں اسی وادی میں گذرا ہے۔

وہ جس خاندان میں پیدا ہوا پھر جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی ضمیر کے ادیب و شاعر بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ وہ ——— اگر دین کی طرف نکل گیا تو ——— درویش گوشہ نشین بن جائے گا اور ——— اگر دنیا میں جا پڑا تو ——— ایک ایسا زمیندار جس کی تعلیم اور زمینداری کم ہوتی ہے اور تکبر اور طنطنہ بہت زیادہ۔ یہ بھی نہیں تو اکھاڑوں میں مگدر ہلائے گا، مجروں میں دھومیں مچائے گا، کتے لڑائے گا، وہ نہیں لڑیں گے تو خود لڑے گا۔ اور ایک دن اغوا کے کسی مقدمے میں ماخوذ ہو کر جیل پہنچے گا یا کسی بلوۂ عام میں مارا جائے گا۔

اس کی طبیعت البتہ شروع ہی سے کچھ والہانہ و عاشقانہ سی تھی۔ وہ گاؤں کے عام لڑکوں کی طرح ہوتے ہوئے بھی ان سے کچھ مختلف ضرور تھا۔ اس کی فطرت میں تنہا رہنے کی ایک شدید رغبت ابتدا ہی سے بہت نمایاں تھی۔ وہ اکثر کھیتوں میں اکیلا نکل جاتا اور پہروں بے مقصد گھومتا پھرتا۔ پرندے اور جانور پالنے کا بھی اُسے شوق تھا۔ گھر کی کئی الماریوں، طاقوں میں اس کے کبوتر، طوطے اور بُلبلیں اور تیتر وغیرہ بند رہتے تھے۔ اس کا زیادہ وقت اِن پرندوں کے ساتھ ان کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا۔ اس کا خاص دوستانہ بھی ان لڑکوں کے ساتھ تھا۔ جو کبوتر اُڑاتے یا بُلبلیں پالتے تھے۔

پڑھنے میں اس کی طبیعت شروع سے آخر تک کبھی نہیں لگی۔ یہ ہمیشہ اس کے لئے مارے باندھے کا سودا رہا۔ ویسے اس کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا اگرچہ امتحان میں پاس ہونے کے ہمیشہ لالے پڑے رہتے تھے۔ نچلے درجوں میں مدرسہ جانے کی بجائے مکئی باجرے کے کھیتوں میں جاکر ڈوب جاتا، رہٹ کی رُوں رُوں سنتا رہتا یا آس پاس کی پہاڑیوں میں جنگلی تیتروں، خرگوشوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ البتہ ثانوی جماعتوں میں اُردو پڑھنے کا چسکہ نہ جانے کیوں اور کس طرح پیدا ہوگیا تھا۔ ناول، اخبار، رسالہ، جنتری جو چیز جہاں ہاتھ لگ جاتی، پڑھ ڈالتا۔ بعض اوقات وہ درسی کتابیں بیچ کر قصبے کے کتب فروشوں سے چٹ پٹے قصے کہانیوں کی کتابیں خرید لاتا۔

خاندان کے لئے وہ کئی اعتبار سے ایک "پرابلم بچہ" تھا۔ بزرگوں کو اس سے "نیک نامی" کی توقع بہت کم تھی اور "بدنامی" کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ اس کے والد ایک متقی و پرہیزگار درویش گوشہ نشین بزرگ تھے۔ علاقے میں دور تک ان کی نیکی و پارسائی کی شہرت تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک "گم ولی" ہیں۔ ان کا گھر دینی تبلیغ کا مرکز تھا۔ مشائخ اور واعظ اس علاقے میں آتے تو انھیں کے ہاں قیام کرتے۔ گاؤں میں وعظ و ارشاد کی اکثر مجلسیں انھیں کے اہتمام سے منعقد ہوتیں۔ ضمیر کی

روش یہ تھی کہ وہ مجلسِ وعظ میں بھی حاضر رہتا۔ مشائخ کی جوتیاں بھی سیدھی کرتا۔ مگر پھر نیلوں، ٹھیلوں، مجروں تماشوں میں بھی برابر موجود ہوتا۔ اس کے رویہ میں ایک ایسی کشادگی و بے نیازی ملتی تھی۔ جس کو سمجھ دار لوگ عموماً "بے ترتیبی، غیر ذمہ داری یا لااُبالیانہ پن" کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ سن و سال کے ساتھ ساتھ یہ لااُبالیانہ پن کچھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بلکہ اب اس میں ایک قسم کی بدحواسی اور فراموش کاری بھی آ ملی تھی۔ ضمیر کے والد کو تو خیر عبادت ہی سے فرصت نہ تھی۔ لیکن خاندان کے دوسرے بزرگ ضمیر سے قطعی "مایوس" تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کارزارِ حیات میں پہلی ہی گولی سے مارا جائے گا یا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے گا۔

لیکن ضمیر نے ان اندازوں کو بڑی حد تک غلط ثابت کر دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ سکول سے بھاگ کر دریا کے کنارے چلّہ کشی شروع کر دیتا اس نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی اور پھر زندگی کے گھمسان میں کچھ اس بے جگری سے گھس گیا کہ

حوریاں رقص کنند ساغرِ شکرانہ زدند

ویسے بزرگوں کا اندازہ بھی کچھ غلط نہ تھا۔ وہ بظاہر ایک جما ہوا ٹھکاپٹا دنیادار شخص معلوم ہوتا ہے جس سے خواہ زراعت کرا لو خواہ تجارت خواہ ملازمت

—— لیکن اندر سے جو اس کا حال ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے تو بعض اوقات اس پر ترس آتا ہے۔ آج کل کی تیز رفتار زندگی جو بازار میں کسی بپھرے ہوئے مست پاگل کی طرح ہنستے بے خبر لوگوں کو چیرتی پھاڑتی گذر جاتی ہے۔ اس کے ایسے بے پروا، بدحواس آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر حیرت بھی ہوتی ہے کہ دیکھو کس خوش دلی و سپردگی سے اپنی لاش کو اپنے گریبان میں چھپائے پھرتا ہے۔ مجھے ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ ابھی ٹھوکر کھائے گا اور یہ لاش چوراہے میں پڑی ہوگی۔ یا کسی وقت دنیا کی نظریں بچا کر وہ اس لاش کو کسی چبوترے پر رکھ کر خود غائب ہو جائے گا۔

زندگی سے ضمیر کے باطنی رشتے کا میں نے بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے مجھے یہ کچھ ناراضامندی کی سی شادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر وہ بڑے خلوص بڑی استقامت سے نون، تیل، لکڑی ڈھوتا رہتا ہے۔ بچوں کو انگلی سے لگائے بازار جاتا ہے۔ پابندی سے ملازمت کرتا ہے۔ لیکن یہ سب ایک سمجھوتہ ہے ورنہ اس کی طبیعت کی بے نیازی اور بے ترتیبی —— جو پہلے خفی سواب بھی ہے :

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی بہروپیا ہے۔ جس نے بال بچے دار آدمی

کا سوانگ بھر رکھا ہے اور جو نہ معلوم کس وقت اس چھینے کو نوچ کر کسی تانگے کے پائیدان پر کھڑا ہو جائے اور شہر میں منادی کرنے لگے کہ لوگو: میں اس سوانگ سے تھک گیا ہوں!

زندگی اور ضمیر کے سمجھوتے میں ضمیر کی حیثیت کسی کمزور ہارے ہوئے فریقِ جنگ کی سی ہے۔ سمجھوتے کی ہر دفعہ اس غریب کی طبیعت کی ضد معلوم ہوتی ہے۔ وہ گاؤں کی زندگی پسند کرتا ہے مگر رہتا شہر میں ہے۔ اس کو تنہائی و گوشہ نشینی عزیز ہے لیکن اس کی زندگی ہنگامہ و ہجوم سے عبارت ہے۔ ملازمت کے لئے وہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ مگر ملازمت کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا کتنی ہی پرانی سماجی قدروں میں وہ قطعاً کوئی اعتقاد نہیں رکھتا مگر ان سب کی احتیاط کے ساتھ پابندی کرتا ہے۔ الغرض زندگی میں وہ تقریباً ہر وہ کام کر رہا ہے جو اسے اپنی دانست میں نہیں کرنا چاہیئے۔ حیران ہوں کہ آدمی اس کی سخت جانی کی داد دے یا سادگی کی؟

زندگی کے بارے میں اس کے نظریات کیا ہیں؟ یہ خود اس کو بھی معلوم نہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل پر غور ہی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ زندگی کو اتنا وسیع بیکراں سمجھتا ہے کہ زندگی کو کسی زاویے سے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

وہ اس کے ہر زاویئے کو ایک روپ سمجھتا ہے اور ہر روپ کو ایک انعام، ایک فیضان ــــ حقائق سامنے بھی آجائیں تو وہ راستہ کترا کر نکل جاتا ہے۔ حقائق سے بچنے کا اس نے یہ نسخہ دریافت کر رکھا ہے کہ حقائق کو نہ خود ہاتھ لگاؤ، نہ خود حقائق کے ہاتھ آؤ ــــ زندگی جیسی اور جس طرح سامنے آتی جائے بازو پھیلا کر اُس کا خیر مقدم کرتے جاؤ!

ویسے اس کے ذہن و خیال میں دھندلے دھندلے ریشمی خوابوں اور ڈوبتے اُبھرتے مرمریں ستاروں کی لامحدود دُنیا آباد ہے کہیں خوش رنگ پھولوں کے تختے ہنس رہے ہیں، کہیں چاندی کے آبشار گر رہے ہیں۔ ساگوان کے پیڑوں پر انگور کی بیلیں چڑھنے لگی ہیں تو میلوں تک انگور میں لپٹے ہوئے ساگوان ہی چلے گئے ہیں۔ وادیوں کے دامن توتیوں سے بھرے ہیں۔ چشمے اُچھل رہے ہیں جھیلیں چمک رہی ہیں، چوٹیوں سے رنگ و نور کے فوارے اُبل رہے ہیں۔ پھر سمندر بھی کچھ دور نہیں ہے جس کے نیلگوں پانی میں خوابگوں جزیرے بکھرے ہوئے ہیں جو کبھی انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتے ہیں کبھی کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ ادھر نم آلود و شاداب ساحل پر اُمنڈے ہوئے سپاریوں اور الائچیوں کے جھرمٹوں میں فرصت اور بےفکری سے لبریز چھوٹی چھوٹی بستیاں، اُجلے اُجلے گاؤں چمک رہے ہیں۔ دھان اور

زعفران کے کھیت ہیں۔ سرو و صنوبر کے سائے ہیں۔ پری چہرہ لوگ۔ بادہ و ساغر عود و عنبر، رقص و نغمہ۔ اور دن ڈھلے جب ان بستیوں میں چراغ روشن ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا چناروں کا ایک بن جل رہا ہے یا ایکا ایکی ہزاروں ذہن خواب جگمگا اٹھے ہیں —— اجنبی اور طلسمی خواب جن میں سے جس کے بھی چہرے سے نقاب اُلٹی جائے تو ہزار ہا دوسرے خوابوں کے در آگے کھلتے چلے جاتے ہیں!

اگر آپ اس شاعرانہ آرزو کو کوئی معروف نظریہ حیات سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ اس کے پاس کوئی نظریہ حیات نہیں ہے اس کے علاوہ وہ کسی نظریئے کا قائل ہے نہ اس کی ضرورت ہی سمجھتا ہے وہ اپنے پھول خود ہی تخلیق کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جس آدمی کے اپنے اندر کوئی پھول نہیں ہے وہ خواہ پوری دنیا میں گھوم آئے اس کو باہر بھی کوئی پھول نہیں ملے گا۔ زندگی کا حسن، کائنات کی آب و تاب اس کے نزدیک انہیں پھولوں سے عبارت ہے جو پہلے انسان کے ذہن میں کھلتے ہیں اور پھر زمین کی گود میں۔ چنانچہ اس کے دامن میں خواہ پھول ہوں یا نہ ہوں، پھولوں کی کمی اس کو کبھی محسوس نہیں ہوتی —— اور اس خیابان کو وہ ذاتی نہیں، کائناتی سمجھتا ہے۔ ذات تو اس خیابان کے گھنے شاخساروں کا ایک لرزتا ہوا سایہ ہے!

اس کی زندگی اور فن پر بھی خیابانوں کے یہی سائے لرز رہے ہیں — زندگی کو وہ اس نظر سے دیکھتا ہی نہیں کہ اس میں کہاں کہاں کون کون سی خامی رہ گئی ہے؟ وہ بس روشنی اور خوبصورتی ہی سے سروکار رکھتا ہے۔ اس کے واسطے چوٹی کا وہی رُخ بہت ہے جس پر سورج کی سنہری کرنیں کھیل رہی ہیں وہ ہر وقت مسکراتے چمکتے ہوئے لمحوں کے تعاقب میں رہتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ جھاڑو لے کر کوچوں کی صفائی کی مہم پر نکل پڑنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ آدمی سے جہاں تک ہو سکے، پھول اگاتا چلا جائے، زندگی ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جائے گی!

یہ نہیں ہے کہ محرومی یا بدصورتی تک، اس کی نظر جاتی ہی نہ ہو بلکہ وہ بدصورتیوں کا ذکر بھی خوب صورتی سے کرتا ہے۔ اس کو زندگی میں مایوسی محرومی کے وجود کے اقرار سے کچھ ہول سا آتا ہے۔ دُکھ درد کے بیان پر وہ کچھ اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے دکھ درد ختم نہیں بلکہ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک کمزور بزدل جذباتی سا آدمی ہو۔ جو اپنی ذات ہی میں گم رہتا ہے یا پھر ہمہ تن ناسور، کہ درد کے تصور ہی سے اس کے زخم کھل جاتے ہیں اور ٹیس ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔

اس نے اپنے اس اندازِ نظر کو ایک مستقل فلسفۂ حیات کا نام دے رکھا ہے۔ اس موضوع پر میری اس سے اکثر بحث رہی ہے۔ میں نے اس کو ہمیشہ سمجھایا ہے کہ مجھے تو تمہارے اس فلسفے میں کچھ ایسا وزن معلوم نہیں ہوتا مگر وہ جواب دیتا ہے کہ تم فلسفے کا وزن تولتے ہو اور میں زندگی کا حسن تلاش کرتا ہوں۔ میرا مقصد چراغ جلانا، گیت گانا، پھول اُگانا ہے! میں جو کچھ ہوں یہی ہوں۔ مجھے کسی کے ردّ و قبول کی بھی کوئی پروا نہیں ــــــ میں یہ ہوں، میں یہی رہنا چاہتا ہوں!

ضمیر کے متعلق میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اس کی شخصیت کے بہت سے مختلف گوشے ابھی باقی ہیں جن پر بہت سی گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن اب یکایک محسوس کیا ہے کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں اس سے اتنا قریب ہوں کہ اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس قُرب سے زیادہ فاصلہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ دراصل اس کے متعلق گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے میں اپنے بارے میں خود گفتگو کروں۔ میں کیا ہوں؟ مجھے کیا معلوم؟ یہ معلوم ہو جائے تو میں وہی کیوں رہوں کہ جو ہوں!

○

جائے کہ من بودم.....

معمولی پسنجر گاڑی، گرمیوں کا موسم اور پنجاب کی ایک ذیلی ریلوے لائن کا سفر۔ درمیانے درجے کے ایک درمیانے سے ڈبے میں پانچ مسافر، آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

میں پانچواں مسافر تھا۔ پہلے چار مسافروں کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ، جیسے طبقہ داری تقسیم کے تحت ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔۔ وہ گھی کے بیوپاری تھے اور گھی کے بیوپار میں اس طرح غرق تھے کہ اس کے سوا وہ گویا کچھ تھے ہی نہیں ؏ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر سے نہیں، گھی کے کنستر سے نکل کر سیدھے گاڑی میں آ گئے ہیں۔ سر کی سرخ ٹوپی سے لے کر، جو اب صرف اوپر ہی اوپر سرخی مائل رہ گئی تھی، پیر کے روغنی جوتوں تک، ہر چیز گھی کی چکناہٹ میں شرابور تھی۔ یہ لوگ گھی خریدنے لالہ موسیٰ جا رہے تھے اور وینا وانیاکو پس پشت ڈالے گھی کی ملاوٹوں میں مل چکے تھے۔ گھی کے متعلق کوئی طبع زاد نکتہ ہاتھ نہ آتا تو لالہ موسیٰ کے کسی موٹے آڑھتی کو اس سے بھی زیادہ موٹی گالی دے کر دونوں زور کا قہقہہ لگاتے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ بلکہ دو ہتڑ مارتے ہوئے اگلے سٹیشن تک سرپٹ چلے جاتے۔

ان سے ہٹ کر دو پڑھے لکھے خوش پوش مسافر سیر و سیاحت کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ دونوں سرکاری وظیفے پر تین تین مہینے کے لیے بیرونی ملکوں سے ہو آئے تھے مگر اس طرح کہ ایک نے صرف امریکہ دیکھا تھا۔ اور دوسرے نے جو کچھ دیکھا تھا اس میں سے صرف پیرس یاد رہ گیا تھا۔ ایک امریکہ کا مدّاح تھا، دوسرا فرانس کا معترف۔ بالخصوص امریکہ والے کو امریکہ اس قدر پسند آیا تھا کہ اپنے وطن سے بیزار ہو چکا تھا۔ گھی کے بڑے بیوپاریوں نے بیزاری کی اس آگ کو اور بھی ہوا دے رکھی تھی۔ ویسے دونوں امریکہ اور فرانس سے لتنے

متاثر ہوئے تھے کہ دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسی پر یہاں آپس میں جھگڑ رہے تھے اختلافات اتنے گہرے تھے کہ بقیہ عمر میں اتفاقِ رائے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ ان کی گفتگو دلچسپ ضرور تھی، مگر مصیبت یہ تھی کہ ان میں سے ایک قدرے اونچا سنتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ دونوں بہت اونچا بولتے تھے۔

دو تین اسٹیشنوں تک میں اکیلا بیٹھا اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی پر غور کرتا رہا۔ کبھی سوچتا کہ مزے میں ہوں، کوئی واہیات سا "مدِ مقابل" مل جاتا تو جان ضیق میں ہوتی۔ کبھی سوچتا نہیں۔ اس درجے میں تنہائی و خاموشی راحت نہیں، اذیت ہے آدمی اطمینان سے پڑھ سکتا تو ایک بات بھی تھی مگر جس بلند پیمانے پر یہ معزز ہم سفر بات چیت کر رہے تھے اس ہنگامۂ صوت و صدا میں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ کتاب نکالی لیکن دو سطروں کے بعد بین السطور سے گھی اُبلنے لگا۔ نیویارک اور پیرس نے راستہ روک لیا۔

بارہا یہ ارادہ ہوا کہ چلو میں بھی ان کی گفتگو میں کود جاؤں مگر پھر طبیعت ادھر نہ آئی۔ "گھی والوں" سے تو اشتراکِ عمل ناممکن تھا کہ یہ موضوع میری گرفت سے باہر تھا۔ دوسرے یہ ڈر کہ اگر گھی کی مختلف ملاوٹیں سمجھ میں آگئیں تو وہ چیز بھی سمجھ میں آ جائے گی جسے ہم گھی سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ امریکہ، فرانس والی بحث یقیناً بڑے ڈھب کی تھی۔ ان ملکوں کا کوئی براہِ راست مشاہدہ تو نہیں میں

نہ تھا لیکن دوسری جنگِ عظیم میں فرانسیسیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ رہا امریکہ تو آج کی دنیا میں امریکہ سے کون ناواقف ہے؟ ویسے گاڑی میں سخن طرازی کے واسطے یہی کافی ہے کہ آدمی منہ میں زبان رکھتا ہو۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ دونوں کسی تیسرے شخص کو دخل دینے کا موقع ہی کہاں دیتے تھے۔ بے ربط مگر مرابط و مسلسل بول رہے تھے۔ ایک کی سانس کے ساتھ جملہ ٹوٹتا تو دوسرا اُچک لیتا۔ دوسرا دم توڑتا تو پہلا تازہ دم موجود۔ شوق و انہماک کا یہ عالم کہ گرمی کا شباب تھا مگر پانی تک نہیں پی رہے تھے مبادا دوسرے کو زیادہ مہلتِ گفتگو مل جائے۔ ایک مرتبہ لیمنڈ کے دو گلاس منگوائے تو پانی کا یہ حشر ہوا کہ گلاس میں پڑے پڑے ان کی بحث کی طرح گرم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ پانی آنے پر امریکہ اور فرانس کے پانیوں کی ایک نئی بحث کا دروازہ کھل گیا۔ اب گلاس ہاتھ میں ہیں مگر گھونٹ پینے کی فرصت نہیں۔ درمیان میں میرا جی چاہا کہ ان سے گلاس چھین کر خود چڑھا جاؤں مگر ع

پھر خیال آیا کہ موسیٰ بے وطن ہو جائیگا

میں چاہتا تو زبردستی ان کی گفتگو میں کود جاتا۔ مداخلتِ بے جا جتنا مذموم فعل ہے اتنا ہی اس کا ارتکاب آسان ہے۔ مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہ تھا۔ کہ میں دونوں کو اکھاڑ پچھاڑ کر اپنے مشرقِ وسطیٰ کو ان کے فرانس اور امریکہ کے

درمیان چھوڑ دیتا لیکن یہ ڈر دامن گیر تھا کہ ان بھلے مانسوں سے یوں چیخ چیخ کر بات کون کرے گا؟ کہیں تھوڑی سی تسکین کی یہ آرزو خوفناک مشقت میں نہ بدل جائے۔ پھر یہ لوگ جو فرانس اور امریکہ ایسے ملکوں پر لہولہان ہو رہے ہیں اگر "مشرقِ وسطیٰ" کے ساتھ مجھ پر بھی پل پڑے تو مجھے کون چھڑائے گا؟

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور میں اسی ٹوہ میں کہ کہیں سے کوئی ہم سفر مل سکے تو پکڑ لاؤں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اس جستجو میں ہر تیز رَو کے ساتھ چند قدم چلتا رہا لیکن ہمارے درجہ کی طرف کوئی نہ آیا۔ ناکام لوٹ کر اپنے درجے میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک نُووارد میرے سامنے والی نشست پر متمکن ہیں۔ خوشی کی حد نہ تھی کہ دیکھو کس طرح اللہ میاں نے گویا چھپر پھاڑ کر ایک رفیقِ سفر بخش دیا۔ نووارد پر ایک بھرپور نظر ڈالی، تو میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ سر گباشتی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر تو آپ نے دیکھی ہوگی۔ اس کی نورانیت، رُوحانیت، ذہانت عظمت اور نفاست وغیرہ ہر چیز خارج کر دینے کے بعد جو کچھ رہ جاتا ہے وہ نووارد کی شکل میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ آنکھیں ضرور بڑی بڑی اور روشن تھیں مگر ؎

صرف آنکھوں کو کیا کرے کوئی؟

سر کے بال اتنے طویل کہ کوئی دوسرا آدمی اٹھا کر چلے۔ سن ساٹھ سال سے اوپر، صحت تگڑی۔ الٰہی خیر! بانگ آمد و سخت آمد۔ مگر پھر دل کو تسلی دی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے نہیں بھی ہے تو چلو، جو مل گیا اس پر قناعت سہی۔

گاڑی حرکت میں آئی تو وہ بھی حرکت میں آ گئے۔ مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں فرمایا البتہ بڑی گھن گرج کے ساتھ فارسی کا ایک شعر پڑھ کر فضا میں چھوڑ دیا ؎

مردہ دل از عمر برخوردن نمی داند کہ چیست
ہر کہ دل زندہ شد عمر سن نمی داند کہ چیست

شعر پڑھنے کے بعد نو وارد نے ہم سب پر تولنے ٹٹولنے والی ایک نظر ڈالی مگر وہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ گھی والے بدستور گھی میں غرق تھے۔ باقی دو وہی یورپ، امریکہ میں گھوم رہے تھے۔ رہ گیا میں۔ تو میں چونکا ضرور۔ دل میں یہ بھی سوچا کہ ہم سفر تو کام کا معلوم ہوتا ہے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کے لئے چپ رہا۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے اُلٹے دینے پڑ جائیں۔

نو وارد زیادہ توقف نہ کر سکا۔ دو چار لمحوں کے بعد آپ نے ایک اور شعر پڑھ دیا۔ اب کی مرتبہ آپ بلند بانگ لیکن نہایت ہی شاعرانہ لَے میں گا رہے تھے شعر تھا ؎

دل زد ستم بدہ آں شوخے کہ از طفلی ہنوز
لذتِ مضمونِ دل بردن نمے داند کہ چیست

واقعہ یہ ہے کہ اس پر ہمارا دل بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بے اختیار دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ایسے صاحبِ دل، عاشق مزاج اور درویش منش بزرگ سے ضرور بات کرنا چاہیئے۔ بات چھیڑنے کی ایک مجبوری یہ بھی آپڑی، کہ اگر مجھے خاموش پاکر انہوں نے ترنم کے ساتھ غزلے دو غزلے چھیڑ دیئے تو رہائی کا آخری روزن بھی بند ہو جائے گا

"مولانا! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں آپ؟" میں نے ہمت کر کے سلسلہ جنبانی کی۔

"ہر شے مسافر ہر چیز راہی"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"جی۔ جی۔ وہ تو بیشک ایسا ہی ہے مگر کہیں تو آپ جا رہے ہوں گے اس وقت" میں نے پھر جسارت کی۔

"گھر میرا نہ دلّی نہ بخارا نہ سمرقند" یہ کہتے ہوئے انہوں نے سر اور گردن کو ایک ایسا جھٹکا دیا کہ ان کے طویل بال دلّی اور بخارا اور سمرقند تک پھیل گئے۔ میں دل میں خاصہ پشیمان ہو رہا تھا مگر سوچا دو ایک ہاتھ اور سہی۔

"یہ حوصلہ اپنی جگہ بڑا قابلِ تعریف ہے۔ تاہم فی الحال کہاں کا قصد ہے

مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔ بولے:

"درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ بزرگوار عاشق ہی نہیں واقع ہوئے مجذوب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر قسم کے مجذوب۔ ماتھا ٹھنکا۔ سخت مشکل کا سامنا تھا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خاموش رہتا ہوں تو وہ گانے لگتے ہیں، بات کرتا ہوں تو بات چلتی ہی نہیں ع

اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

کافی سوچ بچار کے بعد ایک علاج سمجھ میں آیا کہ نثر کے بجائے ان سے شعر میں گفتگو کی جائے۔ مصرعے کا جواب مصرعے سے دو۔ چنانچہ میں نے بھی موقع محل، ربط، مناسبت، ہر معقولیت کو بالائے طاق رکھ کر اقبال کا ایک مصرعہ ٹھوک دیا ع

جو مشکل اب ہے یا رب! پھر وہی مشکل نہ بن جائے

مگر اس مصرع نے یہ مشکل پیدا کر دی کہ مصرع سنتے ہی وہ سچ مچ مرغِ بسمل کی طرح پھڑک اٹھے۔ ان کے تڑپنے پھڑکنے پر تو خیر ہمیں کیا اعتراض ہو

سکتا تھا لیکن دوسرے لمحہ اس مشکل نے یہ خوفناک صورت اختیار کرلی کہ وہ تڑپ کر اٹھے اور مصرع دہراتے ہوئے مجھ نیازمند سے لپٹ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر امریکہ اور فرانس والوں نے تیوری چڑھاکر اپنے وطن کو چند صلواتیں سنائیں اور گھی والوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ وہ تو خیر ایک نظر ڈال کر فرانس اور گھی کی طرف پلٹ گئے لیکن ہماری مصیبت جاری تھی۔ لپٹنا اور عالم جذب و مستی کا لپٹنا۔ اللہ دے اور بندہ لے میں نے اس روز پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ڈوبنے والا بچانے والے کو کس طرح دبوچتا ہے۔ ان کے لپٹنے میں تھوڑا سا اضافہ یہ بھی تھا کہ لپٹ کر اچھلتے بھی تھے —— خیر بہ ہزار دقت میں نے پہلے ان کے بالوں کو اور پھر خود ان کو اپنے سے علٰحدہ کیا۔

"آپ کا تخلص ؟" —— نووارد اب گفتگو کی موڈ میں آ گئے

"کچھ نہیں —— " میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا

"کچھ نہیں۔ سبحان اللہ —— بالکل اچھوتا تخلص ہے ورنہ نوجوان شعرا کو نیا تخلص بھی نہیں سوجھتا۔"

"یہ تخلص نہیں ہے قبلہ —— میں نے عرض کیا ہے کہ میں شاعر وغیرہ کچھ نہیں ہوں ——" میں صاف مکر گیا۔ مبادا کوئی اور ہنگامہ کھڑا

ہو جائے۔"

"ربّ العلیٰ کی قسم! برخوردار تم شاعر پیدا ہوئے ہو ۔۔۔ ورنہ اتنا برمحل مصرعہ اور "حکیم" کے کلام میں سے ۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ اے سبحان اللہ!"

۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ علامہ اقبال کو ازراہِ بے تکلفی محض حکیم کہہ کر پکارتے ہیں۔

"جی نہیں میں قطعاً شاعر نہیں ہوں۔ میرے خاندان میں شاعر تو بجا آج تک کوئی قلعی گر تک پیدا نہیں ہوا ۔۔۔" میں بوکھلاہٹ میں نہ جانے کیا کہہ گیا۔

"اچھا۔ تعجب۔ خیر.... مگر بہر حال سخن فہم تو آپ ضرور ہیں۔"

"جی ہاں۔ کچھ شغف تو ہے ۔۔۔" میں نے اس خوف سے مبادا انکار پر کوئی نیا شاخسانہ پیدا ہو جائے سخن فہمی کی حامی بھر لی لیکن دل میں برابر یہ کانٹا کھٹک رہا تھا کہ اپنی سخن فہمی کے ہاتھوں خدا معلوم میرا کیا حال ہو۔ البتہ ایک تسکین ضرور تھی کہ اب کے یہ گھی اور امریکہ فرانس والے بھی ان کے وجد و حال کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔

میرا خیال تھا کہ اب وہ چھوٹتے ہی اپنا کلام سنائیں گے۔ مگر کلام سے

پہلے انہوں نے اپنا تعارف کرانا بھی مناسب سمجھا تعارف تو بہت لمبا چوڑا تھا کہ انہوں نے اس بہانے سے اپنی ساٹھ سالہ زندگی کی پوری جنتری کھول کر میرے سامنے رکھ دی تھی۔ بہرکیف اس تعارف کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا نام شاہ لعل محی الدین بادشاہ مخدوم تھا۔ صوبہ بہار کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے تھے مگر وہاں صرف پیدا ہو گئے تھے۔ تمام عمر گھومتے پھرتے گزری تھی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ ذریعہ معاش کیا ہے۔ البتہ اتنا صاف ظاہر تھا کہ شعر کہنے اور سفر کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام وہ قطعاً نہیں کرتے۔ شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ تواتر کے ساتھ پشت در پشت ڈھلتا ہوا یہ ورثہ ان تک پہنچتے پہنچتے شاعری سے زیادہ مجذوبیت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تخلص تقریباً ہر سال بدل لیتے تھے۔ آج کل "قادری سہراوردی" تھے۔ شاعری کے سلسلہ میں اخبار و جرائد کے ایڈیٹروں کو بے نقط سناتے تھے کہ یہ لوگ ان کے "پیام" کو قوم تک نہیں پہنچنے دیتے۔ نتیجہ یہ کہ اب ریل گاڑیوں، ٹراموں، موٹروں، تانگوں اور سڑکوں میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا کلام سناتے ہیں —— شعر میں خود کو حکیم کا "نمکخوار" کہتے ہیں۔ کلام سے معلوم ہوا کہ الحکیم کے "نمکخوار" ہی نہ تھے۔ اس کی پوری شاعری کو چبائے جا رہے تھے۔ تخلص کے سوا کوئی چیز اپنی نہ تھی

خیال، نہ اسلوب، نہ الفاظ تخلص کا بھی کہیں کہیں یہ حال کہ گھٹنوں تک بحر سے خارج۔ قادری اندر ہے تو سہروردی باہر۔ دونوں سما گئے ہیں تو مضمون کا پتہ کٹ گیا ہے۔ اس پر ترنم، گویا سونے پر سہاگہ۔ سننے، سنانے والا، دونوں اذیت میں

کلام سنانے بیٹھے تو برابر سوا سو میل تک سناتے چلے گئے۔ تکان اور بے دلی کے مارے برا حال تھا مگر ان کے خوف کی وجہ سے دم بخود بیٹھا سر ہلاتا رہا۔ ڈیڑھ سو میل کے سفر کے بعد بھی جب تخلص کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور ادھر میری منزل مقصود قریب آنے لگی تو میں نے ہمت کر کے ٹوکنا شروع کیا۔ مثلاً ایک خارج از بحر شعر پر عرض کیا:

قبلہ! یہاں — سہروردی کی "وردی" اتر گئی ہے۔

مسکرا کر بولے — "کوئی مضائقہ نہیں —"۔

مگر اس کے بعد کم از کم اتنا ہوا کہ وہ شعر چھوڑ کر فلسفۂ شعر پہ اتر آئے۔ اپنے ایک شعر پر انگلی رکھ کر کہنے لگے:

"دیکھیے — میں نے حکیم کے طائرِ لاہوتی پر اضافہ کیا ہے"۔

میں نے کہا — "منصوبہ تو اچھا ہے، مگر قبلہ جو طائر لاہوتی آپ نے

پیش کیا ہے مجھے تو یہ کوے کی نسل کا کوئی پرندہ معلوم ہوتا ہے۔" اس پر ہنسکر بولے ––– "طائر لاہوتی" کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ –––

"دیتا ہے دھوکہ یہ بازی گر کھلا"

"طائر لاہوتی" کو وہیں چھوڑ کر اب انہوں نے اپنے تھیلے سے ایک رنگین مصور کاغذ نکالا۔ بولے:

"ملاحظہ ہو ––– میرے دیوان کا سرورق۔ یہ تصویر میں نے خود بنائی ہے۔ خیال بھی خاکسار کا اپنا ہے۔"

"مگر دیوان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا

"وہ ابھی مرتب نہیں ہو سکا۔"

سرورق دیکھا تو اس میں کچھ پہاڑ اور درخت تھے جن کی پھننگیوں اور چوٹیوں پر کچھ پرندے پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ دامنِ کوہ میں ندی بہہ رہی تھی جس کے کنارے جھونپڑے میں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جھونپڑے سے قدرے ہٹ کر سبز رنگ کا ایک کنکوا آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ میں نے سرورق دیکھ کر ان کی طرف دیکھا تو بولے:

"غالباً آپ خیال تک نہیں پہنچ سکے۔"

"کچھ کچھ سمجھ تو گیا ہوں" میں نے جواب دیا "مثلاً یہ پرندے تو آپ نے حکیم والے عقاب، شاہین اور جرے بٹھا رکھے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سادھو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟"

"نہیں سمجھے نا ــــ وہ چمک کر بولے ــــ "سادھو نہیں بھئی حضرت یہ وہ درویش خدامست ہے جو شرقی ہے نہ غربی۔"

"اور یہ کنکوا کہاں اڑا جا رہا ہے؟"

"یہ پتنگ نہیں، خودی بلند ہو رہی ہے، خودی۔"

"خوب! بہت خوب! بڑا مبارک، نہایت نیا خیال ہے ــ" میں بے خیالی و بیزاری میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا کہ حواس میں آ کر دیکھا تو حضرت شاہ لعل محی الدین بادشاہ بیاض کا دوسرا جزو کھول رہے تھے۔ میں بھی مزید کلام سننے کو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر دل میں سخت پشیمان، کہ الٰہی! کس جرم میں پکڑا گیا ہوں۔ یہ اندیشہ الگ لاحق کہ اب جو یہ تازہ دم ہو کر بیٹھے ہیں، تو ہو سکتا ہے مجھے اپنے اسٹیشن پر اترنے ہی نہ دیں۔ ادھر اسٹیشن آ جائے اور عین اسی وقت یہ ادھر مجھ سے لپٹے ہوئے ہوں۔ میں انہیں وسوسوں میں تھا کہ تائید غیبی میری امداد کو آ پہنچی۔ ہوا یہ کہ امریکہ اور فرانس والوں میں سے

کسی نے نہ معلوم کیوں بہ سلسلۂ سیاحت روم اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا ع

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے

میری خوش قسمتی تھی کہ یہ آواز حضرت شاہ صاحب کے کان میں جا پڑی۔ آپ مدت کے بھرے بیٹھے تھے کھنکار کر اٹھے اور ان صاحب پر جا پڑے۔ مزید خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ٹھیک اسی وقت میرا اسٹیشن آگیا — اور میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سامان سمیٹ کر نیچے اتر گیا۔

گاڑی چلی تو میں ابھی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اپنا درجہ سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ حضرت شاہ بعل محی الدین بادشاہ مخدوم قادری سہروردی نے فرانس والے کو دبوچ رکھا تھا۔

○

چاچا دینا

"چاچا دین محمد" ہمارے کالج کے ان نامی گرامی طلباء میں سے تھے جو مسلسل فیل ہو کر طالب علم سے زیادہ "پروفیسر" معلوم ہونے لگتے ہیں اور پایانِ کار "خلیفہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے ہیں۔ دین محمد البتہ "خلیفہ" کے بجائے "چاچا" کے ہر دلعزیز نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ "خلیفہ" کیوں نہیں تھے، یا "چاچا" کیوں تھے۔ یہ دراصل آثارِ قدیمہ کی ایک ایسی بحث تھی جس میں پڑنے کی ہمیں نہ فرصت تھی نہ ہمت۔ وہ ہم سے بہت پہلے چاچا کی حیثیت میں "کنفرم" ہو چکے تھے۔ بلکہ "دین محمد" تو مدت سے غائب ہو چکا تھا۔ ہمارے زمانے میں

محض "چاچا" رہ گیا تھا۔ پرنسپل سے لے کر گھنٹی بجانے والے بوڑھے یسین چپڑاسی تک سب انہیں "چاچا" ہی کہتے تھے۔ اب اتنے پرانے راسخ اور رچے ہوئے چاچا کو اکھاڑ کر پاتال سے "دین محمد" کو ڈھونڈنا اور نئے سرے سے اس پر "قبائے خلافت" موزوں کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

یوں بھی وہ اپنے نوعمر اور نسبتاً کم سن ہم سبقوں کے چچا ہی معلوم ہوتے تھے۔ خود ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ شیخ صاحب عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ اپنے پروفیسروں میں سے بعض جو اسی کالج کے پرانے طالب علم تھے چاچا سے بہت پیچھے ہوتے تھے۔ پھر وہ ان کے ہم سبق ہوئے پھر آگے نکل گئے۔ پھر یہیں پروفیسر مقرر ہو گئے مگر چاچا وہی طالب علم کے طالب علم۔

ہمارے وقت میں چاچا رفتہ رفتہ بی۔ اے کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے مگر فائنل میں "ڈیرے ڈالے" ابھی صرف چار یا پانچ سال ہوئے تھے ان کی عمر بیس سے خاصی اوپر نکل چکی تھی، مگر ان کے عزم و استقلال سے نظر آتا تھا کہ بقیہ زندگی مادرِ علمی ہی کے آغوش میں گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے یار لوگوں کا خیال تھا کہ اگر چاچا کی رفتار یہی رہی ——— اور رفتار کے معاملے میں صاف ظاہر تھا کہ جب تک یونیورسٹی اپنی خو نہ بدلے گی، وہ اپنی وضع ہرگز

نہ بدلیں گے ـــــ تو چاچا کا بڑا لڑکا جو اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا، والدِ نامدار کو یہیں آ پکڑے گا بلکہ عجب نہیں کہ وہ باپ سے آگے نکل کر اُس کا "استاد" تک بن جائے۔ بعض زندہ دلوں کی رائے تھی کہ چاچا کالج میں دراصل اپنے فرزندِ ارجمند ہی کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔

چاچا دین محمد بلا کی بھرپور دلچسپ اور گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک خاصے کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ فکر، نہ فاقہ۔ کالج سے نکل کر سیاسیات میں حصہ لینے کا پروگرام تھا، مگر یہ کالج کا مرحلہ ہی کسی صورت میں طے ہونے میں نہ آتا تھا۔ ادھر پالیٹکس بھی آخر کالج سے باہر کھڑے کب تک ان کا انتظار کرتی؟ چنانچہ چاچا کے کالج سے نکلنے کی جب کوئی امید نظر نہ آئی تو پالٹیکس نے انہیں خود کالج کے اندر آلیا۔ چاچا گو اب تک اسمبلی میں نہ پہنچ سکے تھے (اگرچہ پروگرام کے مطابق وہ صوبے کا سب سے کم عمر وزیر ہونے کا امتیاز حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے) تاہم کالج کو انہوں نے اپنے لئے "اسمبلی" بنا لیا تھا۔ مدت تک وہ طلبا کی لیڈری کرتے رہے۔ ہڑتالیں کرواتے اور جلوس نکلواتے لیکن اب کچھ مدت سے انہوں نے گویا "سپیکر" کی سی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ نوجوان لیڈروں کی پیٹھ تھپکا

کرتے، مشورے اور رولنگ دیتے۔ مقامی سیاست کا ہر جوڑ توڑ انہیں کے کمرے میں صورت پذیر ہوتا۔

باتیں کرنے کا انہیں خاص لپکا تھا اور بات کرنے کا خاصا ڈھب بھی آگیا تھا۔ کالج میں اپنی گزشتہ پندرہ سالہ زندگی میں لے دے کر انہوں نے یہی ایک فن سیکھا تھا۔

اپنی مستقل سینیارٹی کے زور پر چاچا ہوسٹل کے شاندار سے شاندار کیوبیکل کے حق دار تھے۔ وہ اچھے سے اچھے کیوبیکل میں برسوں بود و باش رکھ بھی چکے تھے۔ مگر پچھلے دو ایک سالوں سے تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے کونے کی ایک لمبی ڈارمیٹری میں پڑے تھے جس کے ساتھ ملی ہوئی ٹک شاپ بھی تھی پھر غسل خانے تھے جن کے سب سے بڑے سرپرست آپ ہی تھے دراصل اب چاچا کی سوشل حیثیت اتنی پھیل پھول چکی تھی کہ کیوبیکل کی تنگنائے غزل" اس پھیلاؤ کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔

یوں تو چاچا دن میں بھی کالج کچھ واجبی ہی جایا کرتے تھے۔ دن بھر ان کی ڈارمیٹری میں ناغہ کرنے والوں کا جمگھٹ لگا رہتا خیر دین کی ٹک شاپ سے لسی شربت، فالودے اور چاٹنے کے ٹرے دن بھر دوڑتے رہتے اور

——دن بھر—— چاچا اپنا خطبۂ صدارت" ارشاد فرماتے رہتے۔ مگر رات کو کھانے کے بعد تو ان کے ہاں باقاعدہ دربار جمتا تھا۔ کامن روم کی سب گپ بیال سمٹ کر وہیں آجاتیں اور رات کو دو دو بجے تک غپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا۔ سپرنٹنڈنٹ اس "مجمع خلافِ قانون" کا سخت مخالف تھا۔ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کو فرداً فرداً وہ اس خطرے سے متنبہ بھی کردیتا تھا۔ مگر چاچا کو اس مخل آرائی سے روکنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ چاچا کو ہوٹل اور کالج دونوں جگہ ایک قسم کی "صوبائی خود مختاری" حاصل تھی اور واقعی جب وہ اس دربارِ عام میں صرف بنیان اور دھوتی پہنے آلتی پالتی مارکے بیٹھتے تو اپنے گھٹے ہوئے سر، کمر سے دس بارہ اینچ آگے بڑھی ہوئی تونداور تیل پلائی ہوئی رانوں کے ساتھ یوں معلوم ہوتے جیسے کارپوریشن کا کوئی ڈپٹی میئر بیٹھا ہو۔

—— چاچا ہاسٹل کے بے تاج بادشاہ تھے:

چاچا کی باتوں کا کوئی خاص موضوع نہ ہوتا تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ گفتگو برائے گفتگو میں کسی خاص موضوع کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور چاچا تو خیر گھنٹوں بیٹھے پرپنسل ہی میں سے کیڑے نکال سکتے تھے۔

تاہم دو تین موضوعات انہیں بطورِ خاص مرغوب تھے۔ ایک تو انہیں سینما سے سخت نفرت تھی۔ لہٰذا اس کے خلاف مسلسل بولتے تھے۔ ایکٹروں، ایکٹرسوں، ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، تماشائیوں سب کو بے نقط سناتے۔ سینما سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ کسی ایکٹر کے نام یا اس کی صورت تک سے واقف نہ تھے۔ دیواروں پر سینما کے اشتہارات دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے۔ منہ پھیر لیتے۔ گمان ہوتا تھا جیسے سہراب مودی، شانتا رام وغیرہ سے انہیں کوئی ذاتی دشمنی تھی۔

چاچا کو اپنے خاندانی شرف و امتیاز پر فخر تھا۔ ایک نامور قدیم خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اجداد میں اکثر بزرگ جلیل القدر شہنشاہوں کے وزیر اور منصب دار تھے۔ موجودہ اور گزشتہ دونوں نسلوں کے رشتہ داروں میں تحصیلدار، نامزد ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی کمشنر، کمشنر، کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر اور صوبائی اور مرکزی وزراء بھرے پڑے تھے۔ ہوٹل میں انہیں جو رشتہ دار ملنے آتا اس کا کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ ضرور ہوتا جس سے ہمیں بعد میں مطلع کیا جاتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے چار سالوں میں صوبے کا جو بڑا آدمی بھی مرا تھا، چاچا کا رشتہ دار تھا۔ چاچا نے ایک

ایک کا تعلقِ خاطر کے ساتھ سوگ منایا۔ آخر آخر میں تو نوبت یہ ہوگئی تھی کہ کسی بڑے افسر یا نامور لیڈر کے مرنے کی خبر اخبار میں نظر آئی نہیں کہ لوگ خود بخود اظہارِ تعزیت کے لئے چاچا کی ڈارمیٹری میں پہنچ گئے۔ اس طرح ترقیوں اور تقرریوں، صدارتوں اور وزارتوں وغیرہ پر مبارک باد کی تقریبات رہتیں۔ — بد خبری ہو یا خوش خبری۔ وہ احباب کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ خاطر مدارات کے خلوص، گرم جوشی اور اندازِ مدارات سے آپ یہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ یہ کوئی مجلسِ غم تھی یا محفلِ نشاط۔

منظور اور میں ہم دونوں چاچا کے پاس مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ چاچا کا دستور تھا کہ کھانے کے بعد شام کو جو بیٹھک ہوتی تھی، اس میں زیادہ تر اپنے عزیزوں رشتہ داروں ہی کے "فضائل" بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ "شجرہ نسب" کے "درخت" پر چڑھ جاتے تو اترنے کا نام نہ لیتے۔ پہلی سانس میں خانِ خاناں بیرم خاں پر جا کر رکتے۔ دوسرا پڑاؤ تیمور کے ایک وزیر پر ہوتا۔ تیسری منزل سکندرِ اعظم کے جرنیل سیلوکس پر۔ شجرۂ نسب کا یہ درخت بہت ہی لمبا چوڑا تھا اور چاچا باقاعدگی سے اس کی شاخوں ٹہنیوں وغیرہ کا جائزہ لیتے تھے ہم روزانہ یہ قصے سن سن کر عاجز

آچکے تھے مگر ہوسٹل میں رہ کر چاچا کے ہاں گئے بغیر بات بنتی نہ تھی۔

○

سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا ہوسٹل کا شیرازہ بکھرنے والا تھا۔ فائنل کے طلباء جن میں بادلِ ناخواستہ چاچا بھی شامل تھے۔ جونیئر طلباء سے ایک الوداعی دعوت کھا کر گھروں کی راہ لینے والے تھے۔ فرصت اپنے فکری بے تکلفی اور چیل چلاؤ کے دن تھے۔ چاچا کی ڈارمیٹری معمول سے زیادہ آباد تھی۔

میں اور منظور ایک شام چاچا کی طرف جا رہے تھے کہ منظور بولا "یار یہ چاچا کے رشتہ داروں نے دم ناک میں کر دیا ہے۔"

"بات تو یہی ہے۔ مگر بھائی —— تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں جی۔" منظور نے جو خود بھی ایک ہنگامہ پسند "لیڈر طبع" نوجوان تھا سر کے گنجان بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "خدا کی قسم! میں اس چاچا کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا۔ کم از کم اسے معلوم تو ہو جائے کہ ہم لوگ، جو اتنی مدت "بنتے" رہے ہیں تو نرے چغد نہ تھے۔"

"مگر کیسے؟" میں نے اسکیم پوچھی۔

"اسکیم یہ ہے" منظور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اسکیم یہ ہے کہ آج میں بھی اپنے رشتہ داروں کی ڈینگیں اڑاؤں گا۔ رشتہ دار پر رشتہ دار چھوڑوں گا نہلے پر دہلے ماروں گا۔"

"مگر اتنے ڈھیر سے اونچے اونچے رشتہ دار کہاں سے لاؤ گے پیارے!" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لے دے کے تمہارا ایک چچا دفعہ ۳۰ کا مجسٹریٹ تھا۔ سو پچھلے سال سے موقوف ہو کر وہ بھی گھر آبیٹھا ہے — گنجی نہائے کیا — نچوڑے کیا؟"

منظور نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہا "جیسے وہ ساری دنیا سچ مچ چاچا کی رشتہ دار ہوتی ہے۔ تمہارے نزدیک ایشیا کی پوری تاریخ غالباً چاچا کے خاندان پر اتری ہے؟ — میرے بھائی! جب رشتہ دار پکڑنے ہی ٹھہرے تو — ملک خدا تنگ نیست۔"

○

ہم پہنچے تو ڈارمیٹری کی محفل رنگ پر جارہی تھی۔ سامعین برف میں لگے ہوئے دہی کی یخ لسی پی رہے تھے اور چاچا اپنے شجرہ نسب کے درخت پر بہت اونچے جا چکے تھے۔ غالباً سلیوکس کے آس پاس کہیں پھر رہے تھے

چاچا ذرا اور اونچا جلانے لگے تو منظور نے ٹوکنا شروع کیا۔ درمیان میں موقع بے موقع اپنے بزرگ چھوڑنے شروع کیئے۔ ظاہر ہے کہ چاچا کے لیئے یہ بات سخت ناگوار تھی۔ انہوں نے پہلے تو نرمی اور شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ عزیزِ من دیکھو۔ دوسرے کی بات کاٹنا سخت بدتمیزی کی بات ہے لیکن جب منظور باز نہ آیا تو چاچا قدرے برہم ہو کر بولے:

"—— افسوس کہ بی۔ اے کا امتحان تک دے بیٹھے ہو اور جن نولیل ٹٹ پونجیوں میں سے تم ہو۔ اندیشہ ہے کہ پاس ہو کر رہو گے لیکن برخوردار تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نہیں جا رہے۔ اس کلر کی والی ڈگری کو شہد لگا کر چاٹتے رہنا۔

—— لیکن منظور پر کسی تادیب یا سرزنش کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ چاچا کے بڑے اپنے رشتہ داروں اور بزرگوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگائے جا رہا تھا —— چاچا کی پیش قدمی کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ لوگ حیران تھے۔

بات جب بڑھ گئی تو پنچوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر طے یہ ہوا کہ اگلے ہفتے کی رات کو چاچا اور منظور دونوں اپنے اپنے قدیم و جدید قابلِ فخر بزرگوں اور رشتہ داروں کی تصویریں لائیں گے اور تاش کے پتوں کی طرح ان تصویروں سے کھیلا جائے گا۔ کرکٹ ٹیم کے ہر دلعزیز کپتان آفتاب احمد خاں کو ثالث بالخیر مقرر کیا

گیا۔ اور فتح و شکست کا اصول یہ وضع ہوا کہ عہدہ و منصب کیسے بھی خیر کچھ نمبر ہوں گے لیکن ہار جیت کا اصل دار و مدار رشتہ داری کی "شکل و صورت" پر ہو گا۔ دونوں طرف سے پانچ قدیم بزرگ "اور دس جدید رشتہ دار کھیلنے کی اجازت ہو گی ـــــ اتنے بڑے دو خاندانوں میں سے دس بیس آدمی تو نکل ہی آنے چاہئیں ورنہ وہ بڑا خاندان ہی کیا جس کے پاس بزرگوں کی تصاویر تک نہ ہوں۔"

○

ہفتے کی رات کو چاچا کی ڈارمیٹری میں رش کا یہ حال تھا کہ اکھاڑہ ڈارمیٹری ہی سے اٹھا کر ہوسٹل کے چمن زار میں قائم کرنا پڑا۔ کچھ ایسا منظر تھا جو الیکشن کے دنوں میں پولنگ سٹیشن پر نظر آتا ہے۔ چاچا اور منظور کے حامیوں کے الگ الگ کیمپ تھے۔ چاچا کے کیمپ میں رونق اور گہما گہمی تھی۔ لسی اور فالودہ تقسیم ہو رہا تھا۔ منظور کے کیمپ میں تعلقات کے مارے ہوئے ہم آٹھ دس آدمی بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے بلکہ ہمارا "پہلوان" جو پچھلے تین چار روز سے خدا معلوم کہاں غائب تھا ابھی تک پہنچا بھی نہ تھا۔

بارے کہ کوئی نو بجے کے قریب ہمارا پہلوان بھی آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جس میں اس کے بزرگ بند تھے۔ دوسری طرف چاچا نے

ایک بڑے تھیلے میں "بزرگوں" کا انبار لگا رکھا تھا لیکن ہمیں منظور کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھ کر بھی ایک گونہ اطمینان ہوگیا۔ ورنہ یہاں تو اندیشہ یہ تھا کہ اسے کہیں خالی ہاتھ ہی نہ لڑنا پڑے۔

ٹھیک نو بجے درمیان میں ایک میز بچھا دی گئی اور ثالث آفتاب احمد خاں نے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ چاچا دینا اور منظور آمنے سامنے بیٹھ گئے اور دونوں کے دو دو حمایتی تصویروں کے بنڈلوں سمیت میز کے قریب آ گئے۔ ہجوم پر ایک سناٹا چھا گیا جیسے واقعی کوئی تاریخی معرکہ ان کے سامنے تھا۔

چاچا نے سب سے پہلے وہی خان خاناں بیرم خاں کھیلا۔ ثالث نے بیرم خاں کی تصویر اٹھا کر چاروں طرف گھما کر تماشائیوں کو دکھائی اور پھر چاچا کے سرگرم حمایتی لالہ یعقوب نے تاریخ ہند میں سے بیرم خاں کے حالات پڑھ کر سنائے حاضرین نے پر شور تالیوں سے "بیرم خاں" کا استقبال کیا ـــــ بیرم خاں ہندوستان میں چاچا کے مورث اعلیٰ تھے۔

"بیرم خاں" کو دیکھ کر ہمارے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں ہمیں یقین تھا کہ منظور کے لفافہ میں پٹواریوں، گرداوروں اور نہر کے پنسال نویسوں وغیرہ کے سوا اور کیا ہوگا؛ اور یہ سب کے سب مل کر بھی "بیرم خاں" کو چت نہیں کر سکتے

مگر منظور بڑے اطمینان سے اٹھا اور لفافے میں سے ایک تصویر کھینچ کر میز

پر ڈال دی۔ ثالث نے تصویر ہاتھوں میں بلند کی تو لوگ بھونچکا رہ گئے ــــ

یہ جلال الدین اکبر شاہنشاہ ہندوستان کی تصویر تھی۔

تصویر اگرچہ خاندانی نوادر کے بجائے کسی کتاب میں سے پھاڑی گئی تھی مگر اکبر

بہر حال اکبر تھا۔ لالہ یعقوب نے ایک آئینی اعتراض کرتے ہوئے پوچھا تو کیا آپ

مغل بادشاہوں کی اولاد میں سے ہیں؟"

"جی ہاں! میں دارا شکوہ کی نسل میں سے ہوں۔ ذرا صبر کیجئے ابھی اورنگزیب

بھی میدان میں آرہا ہے۔"

اس پر دونوں طرف بڑا ہنگامہ ہوا۔ ایک دوسرے سے ثبوت طلب

کئے گئے لیکن معلوم ہوا کہ ثبوت دونوں کے پاس کوئی نہ تھا ــــ چاچا

کے پاس بیرم خاں کی پرانی روغنی تصویر ضرور تھی لیکن ہمارا جواب تھا کہ ایسی تصویریں

تو کباڑیوں کے ہاں سے عام مل جاتی ہیں۔ بہر حال ثالث نے اکبر کے حق میں

فیصلہ دے دیا اور اس پہلی شاندار فتح کے ساتھ ہی رائے عامہ کی ہمدردیاں بھی

ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ ثالث کو منظور نے پہلے گانٹھ رکھا تھا۔

یہاں چاچا کے طرف داروں نے ایک اور چال چلی۔ انہیں معلوم تھا کہ

چاچا کے پاس قدیم بزرگوں میں وزراء، امراء اور جاگیردار وغیرہ ہی تھے یا زیادہ سے زیادہ سیلوکس اور امیر تیمور کا ایک سپہ سالار تھا مگر وہ اب جان گئے تھے کہ منظور کے لفافے میں بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پورا خاندانِ مغلیہ بند تھا۔ بادشاہ لاکھ لُٹ پُٹ جائے آخر بادشاہ ہے پھر بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر وغیرہ کو کون شکست دے سکتا ہے۔ ان کے مقابلہ کے لئے سیلوکس کے آقائے ولی نعمت خود سکندرِ اعظم کی ضرورت تھی۔ مگر سکندرِ اعظم بد قسمتی سے چاچا کی پٹاری میں موجود نہ تھا اور یہ بیرم خاں، خافی خاں، آصف الدولہ اور شائستہ خاں، جنہیں چاچا اٹھائے پھر رہے تھے اگرچہ بڑے نام آور بزرگ تھے لیکن اگر سچ مچ یہ تصویریں زندہ ہو جائیں اور منظور کے لفافہ میں سے نکل کر شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر ان کے سامنے آ جائیں تو یہ سب ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر چاچا کے حامیوں نے پینترا بدلا۔ انہوں نے کہا چونکہ مغل بادشاہوں کا معاملہ درمیان میں آ گیا ہے اور بادشاہوں کے معاملے میں مسلمان بیحد جذباتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں انصاف کی توقع نہیں۔

اب جدید زمانہ کے رشتہ داروں میں مقابلہ شروع ہوا۔

چاچا کی طرف سے ایک بزرگ کھیلے گئے۔

خشخشی داڑھی اور لبوں پر سے کتری ہوئی مونچھیں۔ سنہری فریم کی عینک لارڈ لنلتھگو کے زمانہ میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے یہ ان کے پھوپھا تھے۔

الٰہی خیر! پرانے زمانے کے قصے میں تو منظور بادشاہوں کو اپنی کمک پر لے آیا تھا لیکن ان وزیر صاحب کا توڑ کہاں سے لائے گا ــــــ؟ ہمیں اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی۔

"یہ ہیں میرے ماموں" منظور نے ایک خوب صورت نوجوان کی تصویر میز پر رکھتے ہوئے کہا: "ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بی۔ اے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے تھے۔ زندہ رہتے تو بڑے مرتبے کو پہنچتے۔"

تصویر گھمائی گئی تو وہ النّاصر یا ویپ کمار میں سے کسی فلم ایکٹر کی تصویر تھی۔ چاچا کو تو خیر کیا پتہ چلتا، مگر لالہ یعقوب نے فوراً اعتراض کیا:

"یہ تو فلم ایکٹر النّاصر کا فوٹو ہے۔"

"ممکن ہے دونوں ہم صورت ہوں ویسے یہ میرے ماموں، خداداد حسین خاں ہیں۔" منظور نے انتہائی بے پروائی اور پر اعتمادی سے جواب دیا

اور ثالث نے اعتراض رد کر دیا۔

اب چاچا کے حامیوں نے پبلک سروس کمیشن کی ممبری کو اچھالنا شروع کیا لیکن ادھر خداداد حسین خاں بھی۔ بڑی صلاحیتوں کا نوجوان تھا۔ بی۔ اے میں بی۔ اے کا ریکارڈ توڑ چکا تھا موت مہلت دیتی تو کیا عجب تھا کہ ایم اے میں سرے سے یونیورسٹی ہی کو توڑ کے رکھ دیتا اور پھر سول سروس کے مقابلے میں کم از کم پہلے نمبر پر آتا اور کسی "برخوردار صوبے" کی چیف کمشنری پر ہاتھ صاف کر جاتا۔"

یہاں چاچا کے وکیل یعقوب لالہ نے ایک دلچسپ آئینی نکتہ اٹھاکر چاچا کے پھوپھا کی فضیلت ثابت کرنے کی ایک آخری کوشش کی دلیل یہ تھی کہ پھوپھا دیر مناصب تھے۔ لہذا خداداد حسین خاں کی کامیابی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یوں بھی چننے والے اور چنے جانے والے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے

منظور نے جواب دیا۔

"اگر آپ کے پھوپھا میاں خُداداد جیسے جینیئس نوجوان کے چناؤ کی مخالفت کرتے تو اس کے معنی صاف یہ تھے کہ وہ خود اپنے منصب کے نااہل تھے ...." اور اس پر رائے عامہ نے جواب چاوچا امیر کے مقابلے

میں غریب کا ساتھ دیے رہی تھی، واد وا کا ڈونگا برسا دیا اور جوانا مرگ خدا داد حسین، پبلک سروس کمیشن کے ممبر پر بازی لے گیا۔

چاچا نے اس پر تاؤ کھا کر بڑے زور سے ایک تصویر میز پہ پٹخ دی شیروانی کے ساتھ شلوار پہنے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک صاحب تھے۔ جنہوں نے سکندر حیاتی طرز والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مڈل تک پڑھے ہوئے تھے مگر ایک صوبے کے وزیر رہ چکے تھے۔ اب اگرچہ کچھ مدت سے بے مصرف سے ہو چکے تھے تاہم صوبے کے اونچے لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ہر وزارتی ردوبدل کے موقع پر زیرِ غور امیدواروں کی فہرست میں ان کا نام ضرور لیا جاتا تھا۔ ہاں ایک "ٹانگ" دوسری سے قدرے چھوٹی تھی۔ چاچا نے ان کی تصویر کے ساتھ اخبارات کے تراشوں کا ایک ڈھیر بھی میز پر ڈال دیا۔ یہ وہ بیانات تھے جو چاچا کے اس خالو نے وقتاً فوقتاً شائع کرائے تھے مگر چاچا کے یہ سابق وزیر اور حال لیڈر خالو، شکل و صورت کے نمبروں پر منظور کے چچا "سہراب مودی" کے ہاتھوں پٹ گیا۔

خالو کے بعد چاچا کے سات آٹھ چچے اور تایا، چچوں کے بچے اور تایا۔

جن میں دیہات سدھار کا ایک کمشنر، تعلقاتِ عامہ کا ایک ڈائرکٹر اور فوج کا ایک بوڑھا آنریری کپتان زیادہ نمایاں تھے یکے بعد دیگرے یہ سب منظور کے ایکٹروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ چاچا کے رشتہ داروں کو اصل میں تجربہ یہ آپڑا تھا کہ دفتر کی کرسیوں نے ان کے چہرے بری طرح مسخ کر ڈالے تھے۔ فائلوں نے آنکھوں سے چمک اور رخساروں سے زندگی نچوڑ رکھی تھی۔ کہیں کہیں اگر چہرے پر تھوڑی بہت رونق بحال تھی تو چاچا کے خاندان کے خوف ناک طور پر اونچی، نکیلی اور مڑی ہوئی خاندانی ناک نے حالات کو سخت ابتر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف منظور کے معمولی معمولی عہدہ دار، سیاح، تاجر اور پروفیسر تھے مگر در اصل چونکہ سب ایکٹر تھے۔ لہٰذا ویدہ زیبی کے پورے نمبر لئے جا رہے تھے، جو ہار جیت کا اصل معیار طے پا چکا تھا۔ ہوسٹل کی رائے عامہ جیسے کالج کے بعد اپنے سامنے بھی معمولی کلرکی کا میدان سامنے نظر آ رہا تھا اونچے منصب داروں کے خلاف تھی۔ کچھ چاچا کی "خاندانی ناک" نے اسے مشتعل کر رکھا تھا چنانچہ جب تعلقاتِ عامہ کے ڈائرکٹر پر بحث ہو رہی تھی تو تماشائیوں میں سے کسی نے بآوازِ بلند کہا:

• اسے اٹھا کر کسی عجائب خانہ میں رکھ دیجیئے جناب!

بہرحال جب رشتہ داروں کا یہ "جلوس" بہت لمبا ہو گیا تو تماشائیوں میں سے کالج ڈرامیٹک سو سائٹی کے شرپسند ونڈیلہ سیکرٹری سعداللہ بٹ نے چلا کر مطالبہ کیا:

"اپنے اپنے والدِ ماجد میدان میں آ تار دیئے۔" یہ مطالبہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ تمام ہجوم یکبار گی چلّا اٹھا۔

"باپ چلیئے۔ باپ لائیے... باپ۔ باپ۔ باپ۔" مگر باپ نہ چاچا کے بنڈل میں تھا نہ منظور کے لفافے میں۔

○

ابن الوقت

"ابن الوقت" کی کوئی فیصلہ کن تعریف کرنا مشکل ہے۔ آرٹ کے بارے میں کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی جا سکتی اور "ابن الوقتی" ایک آرٹ ہے

نہ حد جس کے پیچھے، نہ حد سامنے

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "ابن الوقت" زندگی کے عزیز ترین اصولوں اور مقدس سے مقدس قدروں کو فروخت کر دیتا ہے ..... وہ ایک بہت صیقل شدہ خوش آمدی ہے .... کہ دارو ضمیر کے ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے .... اس کی اپنی کوئی شخصیت ہے نہ چھاپ، اصول نہ عقیدہ۔

لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ انسان جب باتیں کرنے پر آتا ہے تو سطحی سے سطحی موضوع پر بھی گہری سے گہری باتیں کر سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ ابن الوقت سمجھنے کی چیز ہی نہیں، جو سمجھ میں آگیا وہ ابن الوقت کیسا؟

"ابن الوقت" جس روز سمجھ میں آگیا، یہ سمجھئے کہ ختم ہو گیا — مر گیا — ادراک کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے "ابن الوقت" وہاں سے شروع ہوتا ہے سچ پوچھئے تو "ابن الوقت" کو خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ یہ دراصل ایک نہایت نازک سے توازن کا مسئلہ ہے۔ لوگ توازن کھو بیٹھے پہچانے گئے جنہوں نے سلیقے سے کام لیا وہ بسا اوقات اپنے وقت کے اکابرین میں شامل ہو گئے۔

ادیب و شاعر کی طرح "ابن الوقت" بھی پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا بنایا جائے تو کچھ مزیدار سا نہیں بنتا۔ شاعر کم اور عالم زیادہ بن جاتا ہے مشق و ریاضت سے نکھرتا ہے، پھر جس طرح ادب اعلیٰ درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے یعینہ "ابن الوقت" بھی اعلیٰ، درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے کبھی ناول کی طرح طویل، کبھی رباعی کی صورت مختصر اور کبھی تو بالکل استعارہ ہی استعارہ۔ دریا بہ حباب اندر، پلک کا یہ عالم کہ "ابن الوقت" کا تجربہ ہی شاید بیک ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب زندگی تخلیق

کرتا ہے اور "ابن الوقت" اس کو برتتا ہے۔ شاعر ہجو کا مزا ہے۔ "ابن الوقت" مزے کرتا ہے

بعض لوگ "ابن الوقت" کو بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار سمجھتے ہیں وہ اپنی سرشت میں بھاپ اور بجلی ضرور ہے لیکن بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار ہرگز نہیں ——"ابن الوقت" کا شجرہ نسب خود وقت ہی کے شجر سے پھوٹا ہے دونوں کی تاریخ پیدائش قریب قریب ایک ہے جب سے وقت ہے "ابن الوقت" بھی ہے۔ البتہ پہلے شاید زمین سے آہستہ آہستہ اگتا ہو۔ اب مشین میں ڈھلتا ہے —— وقت اچھے تھے تو "ابن الوقت" بھی "نجیب الطرفین" تھے جیسا وقت ویسا "ابن الوقت" برق اور ایٹم کے دور میں پتھر اور دھات کا "ابن الوقت" کہاں؟

بادشاہ سلامت کے بٹیر کو جو لوگ "رستم و افراسیاب" کہتے تھے اور بڑے بڑے پہلوانوں کی دستارِ فضیلت اتار کر بٹیر کے سر باندھ دیتے تھے وہ احمق نہ تھے۔ اپنے وقت کے نہایت ذہین اور کامیاب "ابن الوقت" تھے چنانچہ تذکروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رستم و افراسیاب اپنی جگہ "رستم و افراسیاب" اور بٹیر بٹیر ہی رہے البتہ "ابن الوقت" جتنے روز جیے ٹھاٹھ کر گئے۔ اب نہ وہ دولے بادشاہ اور نہ وہ موتیوں والے بٹیر نہ وہ سادہ و معصوم "ابن الوقت"!

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بادشاہ، ابن الوقت اور بٹیر کا قصہ بھی عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے تینوں ایک دوسرے کے بطن سے نکلے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہتے۔ رہتے ہیں تو کچھ "بیوہ" سے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب سے بادشاہ اٹھ گئے ہیں بٹیر بھی اڑ گئے ہیں۔ "ابن الوقت" نسبتاً زیادہ جاندار نکلا کہ "انڈر گراؤنڈ" چلے گئے، جو ذرا سمجھ دار تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ ـــــ ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور، تو وہ دفتروں اور کارخانوں میں ملازم ہو گئے، صنعت، تجارت اور سیاست کے کوچوں میں جا نکلے یہ دیکھ کر بادشاہ اور بٹیر بھی بھیس بدل کر واپس آ گئے۔ صورت بدل گئی تھی، سیرت وہی تھی۔ وہی بادشاہ، وہی بٹیر، وہی ابن الوقت!

نہ میں بدلا، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی!
میں کیسے اعتبارِ گردشِ دوراں کر لوں

میں تاریخ کی کسی عالمانہ بحث کا اہل نہیں ہوں مگر کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کے بیشتر بادشاہوں کی تاریخ اصل میں "ابن الوقت" اور "بٹیر" کی تاریخ ہے جن چند بادشاہوں نے اپنی تاریخ خود پیدا کی ہے ان کو "ابن الوقت" چھوڑ گئے یا بصورتِ دیگر بادشاہوں کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر "ابن الوقت" نہ ہوتا تو شاید سرے سے کوئی تاریخ ہی نہ ہوتی ...... تاریخ نہ ہوتی تو فلسفہ کہاں ہوتا؟

فلسفہ نہ ہوتا تو..... بہرحال اس بحث کو میں ذرا بعد پر اٹھا رکھتا ہوں — کیونکہ اگر بحث طویل پکڑ گئی تو صرف تاریخ رہ جائے گی اور "ابن الوقت" نکل جائے گا۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں میں سب سے اہم کون ہے؟ — بادشاہ — ابن الوقت یا ٹیپر؟ بدیہی جواب تو یہی ہوگا کہ بادشاہ — لیکن صاحب ہر چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی — ذرا ایک لمحے کے لئے یہ نقشہ تو ذہن میں جمائیے کہ بادشاہ سلامت اجلاس فرما رہے ہیں سامنے زرق برق پیچوان لگا ہے — ظلِ سبحانی کش لگا کر اِدھر اُدھر خلا میں دیکھ رہے ہیں مگر کوئی ادا شناس موجود نہیں ہے جو حقے کا ٹیپر بنا دے — یعنی ایک ایک کش پر دو دو مرتبہ اٹھے تین تین مرتبہ کورنش بجا لائے پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کرے کہ خداوند کے خمیرے کی خوشبو سے روم اور چین کی وسعتیں بھر گئی ہیں.... سلطانِ اعظم نے دیوانِ خاص کے ایک گوشے پر ایک عام نظر ڈالی ہے لیکن کوئی نہیں جو نوبت کی چوٹ پر اعلان کر دے کہ پورے شہر میں موتیوں کا مینہ برس گیا ہے — غور فرمائیے یہ بادشاہ تو نہ ہوا، ٹیپر ہوا، زیادہ سے زیادہ کوئی خوشحال مزدور ہے جو فتوحات کی مشق میں گرفتار ہے۔ تاج و تخت پر لات مار کر درویشی و گوشہ نشینی اختیار کرنے والے بادشاہ غالباً وہی بادشاہ تھے جن کو "ابن الوقت" اور ٹیپر میسر نہ تھے۔

ویسے بادشاہ ابن الوقت اور ٹیڈ اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کو ٹیڈ سمجھتے ہیں اور کچھ غلط نہیں سمجھتے — کیونکہ جس آدمی کو بھی کھرچا جائے ایک سطح پر جا کر ضرور اندر سے ٹیڈ نکلتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ لوگ آخر خودکشی بھی تو کر لیتے ہیں ...؟

"ابن الوقت" کا ٹیڈ ہونا ہمیں لازمی طور پر نظر آتا ہے۔ یہ تو زندگی کی طرف ایک خاص زاویے سے دیکھنے کا نام ہے جس کی سب سے بڑی اور غالباً واحد خصوصیت یہ ہے کہ یہ زاویہ وقت اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا اور بدلتا جاتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا — ایک دفتر کے افسر اعلیٰ نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لیں — لوگ سمجھے یہ شخص تو شاید سالانہ رپورٹ بھی مو[illegible] کا کھول بلند ٹائپ سے لکھے — نتیجہ یہ ہوا کہ پورے محکمے میں ایک سے ایک لمبی مونچھ لہرانے لگی۔ ایک صاحب خیر سے کچھ ادیب تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ادب کے "ابن الوقت" تھے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں "ابن الوقت" ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو ستم ظریفی کی حد کر دی یعنی مونچھوں کے فوائد و فضائل پر سو سوا سو صفحے کی ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ باہر سرورق پر [illegible] کی تصویر تھی۔ تصویر بھی کیا تھی؟ مونچھیں ہی مونچھیں تھیں! اور کتاب کے اندر طب و تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا گیا تھا کہ انسانی عظمت ہمیشہ مونچھوں کے پیچھے پیچھے چلتی

رہی ہے۔ جن لوگوں نے مونچھ کے بغیر نام پیدا کیا۔ ان کی عظمت اتفاقی تھی عارضی تھی — ناکمل تھی — مصنف کے قول کے مطابق اگر نپولین کے مونچھیں ہوتیں تو وہ یقیناً ساری دنیا کو فتح کر لیتا اور سکندرِ اعظم کو تو بیاس سے لوٹنا ہی اس لئے پڑا کہ بے چارے کے مونچھیں نہ تھیں۔

کچھ پرانے زمانے ہی پر موقوف نہیں مونچھوں کا سلسلۂ فیضان اب بھی جاری ہے مصنف کی رائے میں ہٹلر کی ابتدائی کامیابیوں کا باعث اس کی مونچھ ہی تھی — جتنی مونچھ تھی، اتنی ہی کامیابی تھی — سٹالین کی مونچھ بڑی تھی میدان بھی اسی کے ہاتھ رہا۔ ان کے نزدیک دوسری جنگِ عالمگیر دراصل دو مونچھوں کی لڑائی تھی جس میں بڑی مونچھ نے چھوٹی کو شکست دی۔

الغرض اس طرح انہوں نے افسر کی مونچھ کو اپنا "شیر" بنا لیا۔

تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ فن بھی اپنے سرپرستوں ہی کے دم قدم سے زندہ ہے تصویر کا یہ رخ بھی دیدنی ہے ولی نعمت آٹھ دس ہزار میل دور سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں۔ "ابن الوقت" نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا — نصیب دشمناں، بندگانِ عالی کی آواز کچھ بھاری سی معلوم ہوتی ہے — اور بندگانِ عالی کو سچ مچ زکام ہو گیا —

یہ تو سامنے کی موٹی موٹی مثالیں تھیں ورنہ اہلِ کمال نے اس فن کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ وہ ندرتیں اور باریکیاں پیدا کی ہیں کہ بقولِ غالب

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ "ابن الوقت" کو تو ایک دنیا برا کہتی ہے اور "زر پرست" کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حالانکہ اگر مسخرے ہیں تو دونوں ورنہ کوئی نہیں۔ کیا یہ بھی ایک قسم کی "ابن الوقتی" ہی تو نہیں؟

میں تو بعض اوقات سوچتا ہوں کہ زمانے نے "ابن الوقت" کے ساتھ منصفی کا سلوک نہیں کیا ـــــ تعجب ہے کہ قاتل تک کے ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے مگر "ابن الوقت" کے نکتہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ حالانکہ "ابن الوقت" سوسائٹی کے بعض طبقوں کے لئے پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہے ـــــ ذرا تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالئے اور انصاف سے فرمایئے کہ اس کے جتنے ٹکڑے عبرت یا اختلاجِ قلب کے بغیر پڑھے جا سکتے ہیں وہ کن لوگوں کی داستان ہیں؟

دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنا اور اس کا احترام کرنا کیا خوبی نہیں ہے؟ اس شعبے میں "ابن الوقت" کا ریکارڈ اتنا شاندار ہے کہ کوئی دوسرا فرد یا ادارہ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ حیرت ہے کہ لوگ اس خوبی کو بھی الٹا نقص قرار دیتے ہیں الزام یہ ہے

کہ وہ دوسرے کے نقطۂ نگاہ کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ سبحان اللہ! یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں بہت زیادہ امن قائم ہو گیا ہے!

اب "ابن الوقت" کا ایک بہت بڑا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے خلاف لڑنے سے گریز کرتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ خود اپنے خلاف کس بے جگری سے لڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے کے خلاف لڑنے کے بجائے اپنے آپ کو لہولہان کرنا زیادہ مشکل ہے اور شاید .... نجیب تر بھی۔

میں تو یہاں تک بھی کہنے کو تیار ہوں کہ "ابن الوقت" مرنے کی نہیں جینے کی لڑائی لڑتا ہے ویسے اس نے اصولاً گشت و خون کو ہمیشہ روکا اور حسن و زیبائش، آسائش و کشادگی اور ذائقہ و لذت کو فروغ دیا ہے وہ گولی کا زخم نہیں باغ کا پھول ہے۔ پھول سے آخر لڑنے کی توقع ہی کیوں کی جائے؟ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج تک کوئی "ابن الوقت" خون خرابے کا باعث نہیں ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس قسم کا "ابن الوقت" کوئی گھٹیا "ابن الوقت" ہو گا۔ البوالہوس آخر کس پیشے میں نہیں! مناسب تو یہی تھا کہ مساعیِ قیامِ امن کے اعتراف میں "ابن الوقت" کا شکریہ ادا کیا جاتا لیکن میرزا نے سچ ہی کہا تھا:

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

خود ادب اور لٹریچر پر "ابن الوقت" کے بے شمار احسانات ہیں۔ اکثر و بیشتر ملک الشعراء کون بزرگوار تھے؟ آدمی وہ کیسے بھی ہوں، یہ بتائیے کہ کیسا کیسا تابدار شعر وہ دنیا کو دے گئے ہیں؟ اور جو شخص تہذیب و آدمیت کا اتنا بیش بہا ورثہ چھوڑ جائے وہ خود بنیادی طور پر گھٹیا آدمی کیونکہ ہوا؟ قصور وقت کا ہے "ابن الوقت" کا نہیں!

داستانوں کے کتنے چٹخارے جن سے زندگی کی ہزاروں خوبصورتیاں اور لذتیں وابستہ ہیں کس نے مہیا کی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ "ابن الوقت" مسائلِ حیات کو حل نہیں کرتا لیکن یہ بھی دراصل اس کے ساتھ زیادتی ہے جب وہ مسائل پیدا ہی نہیں کرتا تو حل کیوں کرے؟ دوسروں کی پاداش وہ کیوں بھگتے؟ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ "ابن الوقت" احمق نہیں ہوتا۔ وہ تو محبت تک کی قیمت وصول کر لیتا ہے!

مولوی ڈاکٹر نذیر احمد کے عظیم ناول "ابن الوقت" کو جو ابدیت نصیب ہوئی ہے، وہ اردو کی بہت کم کتابوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ناول کس خونِ جگر سے لکھا گیا تھا؟ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ "ابن الوقت" نہ ہوتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ اردو ادب اس ناول سے بلکہ خود مولوی ڈاکٹر نذیر احمد ہی سے محروم رہ جاتا؟ اور یہ کتنا بڑا تہذیبی زیان ہوتا؟

"ابن الوقت" کی بدقسمتی اصل میں یہ ہے کہ وہ اپنی تاریخ لکھنے کے بجائے دوسروں کی تاریخ لکھتا رہا ہے۔ اپنی تاریخ خود لکھ گیا ہوتا تو دنیا آج اس کی خوبیوں کا بھی اندازہ کر سکتی لیکن بہر حال، اہلِ نظر تو جانتے ہیں کہ وقت کی تاریخ ابن الوقت ہی کی تاریخ ہے۔

"ابن الوقت" کے تذکرے میں سنجیدہ ہونے کی گنجائش ہے نہ ضرورت! یہ خود "ابن الوقت" کے روایات کے خلاف ہے لیکن ایک بات میں پوری سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں خواہ آپ کو میری سنجیدگی پر ہنسی ہی کیوں نہ آجائے: لوگ "ابن الوقت" کو اس شدت و کثرت سے کوستے کیوں ہیں؟ مجھے تو یہ کچھ واجی اور رسمی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس پردے میں خود اپنا دفاع تو مطلوب نہیں ہوتا؟ میں نے تو جب کبھی "ابن الوقت" کو لعن طعن کرنا چاہا، معاً خود اپنے اندر کوئی چیز پھڑپھڑانے لگا۔ کوئی بادشاہ سلامت ٹہلتے ٹہلتے اچانک سامنے آ گئے ـــــ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!

○

دیوان صاحب

ہمارے سرشتہ کے نئے افسرِ اعلیٰ دیوان صاحب کا آج دفتر میں پہلا دن تھا۔ وضع قطع تراش خراش، لباس وغیرہ ہر لحاظ سے وہ اعلیٰ درجے کے انگریز معلوم ہوتے تھے۔ البتہ ایک کان میں مہاراجہ گائیکواڑ کی طرح ایک چمکتا ہوا ہیرا لٹکا تھا۔ آنکھیں خوبصورت اور بڑی بڑی تھیں مگر کچھ خالی خالی، کچھ حیران حیران، جیسے آدمی بیٹھا کہیں ہو، دیکھ کہیں رہا ہو۔ جیسے دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھتا ہو۔

سیکرٹری والی گھنٹی بجی تو میں حاضر ہوا:

"آپ کون ہیں؟"

"جناب میں آپ کا سیکرٹری ہوں۔"

"تو آپ سیکرٹری ہیں؟"

"جناب۔"

"تو آپ سیکرٹری ہیں"۔ دیوان صاحب نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ مجھے سر سے لے کر پیر تک ایک تفصیلی نظر سے دیکھا ––– خیر! تو ٹھیک ہے مگر ایک بات آپ سن لیں کہ میرے ساتھ کام کرنا ایک مشکل کام ہے۔"

"جناب! آپ ایسے خاندانی افسر کے ماتحت کام کرنا تو میری خوش نصیبی ہے!"

"آپ ایسا سمجھتے ہیں تو شکریہ۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے "لیکن آپ مجھے عام آدمیوں سے بہت مختلف پائیں گے۔"

"جی"

"آپ کو میری طبیعت کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔"

"جی! ہم تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں۔"

"سنئے! جب میں بول رہا ہوں تو میں دوسرے کا بولنا پسند نہیں کرتا۔"

"چھٹی آپ اس روز جا سکیں گے جس روز ہم چھٹی پر ہوں گے۔ دفتر کی ساری مخلوق سے واسطہ رکھنا ہمیں پسند نہیں۔"

"بہت بہتر!" مجھے خفیف سی کھانسی آگئی۔

"میں لوگوں کے اس طرح کھانسنے کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور دیکھئے آپ کو زکام بھی کبھی نہ ہونا چاہئے۔"

"بہت بہتر!"

"ہم صفائی، شائستگی، باقاعدگی اور خوش ذوقی کا اعلیٰ معیار چاہتے ہیں۔"

"جی۔"

"پھر سنئے، صفائی! شائستگی! خوش ذوقی! —— آپ نے بکنگھم پیلس تو دیکھا ہوگا۔"

"جی۔ بس تصویریں ہی دیکھی ہیں۔"

"تو آپ انگلستان نہیں گئے۔"

"جی نہیں۔"

"اٹلی یا جرمنی۔"

"جی میں تو اسلامیہ کالج میں پڑھتا رہا ہوں۔ وہاں سے سیدھا اس دفتر میں

آ گیا۔"

"او ہو! یہ تو بڑی کمی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ تیس برس سے اس ایک ملک میں پڑے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ ہماری طبیعت کو سمجھ سکیں گے؟"

"جناب میں کوشش کروں گا کہ جناب کو مطمئن کروں"

"بہر حال صفائی اور باقاعدگی ——— دیوان صاحب ٹہلتے ہوئے دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور پردے کو گھورنے لگے ——— "ادھر تو آیئے"

"جی"

"ہم تو اس دفتر میں بیٹھ ہی نہیں سکتے"

"ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔"

دیوان صاحب واقعی پاگلوں کی طرح اچھلنے لگے۔ پردے کے ایک مقام پر انگلی رکھ کر بولے۔

"یہ کیا ہے؟"

"پردہ ہے جناب"

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب نے ایک ذرا ابھرے ہوئے دھاگے میں انگلی ڈالی اور ایک ہی جھٹکے میں تین چار گز دھاگہ گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

"یہ پردہ ہے؟"

دیوان صاحب اب واضح طور پر جنوں کی ایک کیفیت میں داخل ہو چکے تھے وہ چلّا کر کہتے ـــــ "یہ پردہ ہے؟ ـــــ" اور اچھل کر کچھ دھاگے گھسیٹ کر فرش پر ڈھیر کر دیتے، یہاں تک کہ تمام پردہ تار تار ہو کر زمین پر آ رہا ـــــ

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب ہانپ رہے تھے۔

"جناب مجھے افسوس ہے آپ کو اتنی کوفت ہوئی"

"کوفت؛ یہ تکدر تو اب مہینوں چلے گا"

"جی واقعی میں نادم ہوں"

"نہیں تمہارا کوئی قصور نہیں ـــــ دیوان صاحب کرسی پر جا بیٹھے "تمہارا کیا قصور ہے" وہ جیسے کسی سوچ میں کھو گئے۔ تمہارا کیا قصور ہے، آج کی پوری دنیا ہی ایک ایسا پردہ ہے جس کے سب دھاگے نکلے ہوئے ہیں" اور وہ سوچ کے ایک طویل غوطے میں ڈوب گئے۔ تنگ آ کر میں نے پوچھا۔

"جناب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"کچھ نہیں، تم جا سکتے ہو" وہ بظاہر نارمل ہو گئے تھے" ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ چپ چاپ چلے جایا کریں!"

میں چپ چاپ جانے لگا تو بولے۔

"ٹھہریے! میں آج تمام سٹاف کو ایڈریس کرنا چاہتا ہوں۔ تین بجے!"

"بہت بہتر جناب!"

عام طور پر ہر نئے افسر کی شہرت اس کی آمد سے پہلے ہی دفتر میں پہنچ جاتی ہے۔ دیوان صاحب کی شہرت خاصی تشویش انگیز تھی —— بیان کیا گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے جاگیردار کے فرزند ہیں۔ پورے تیس برس یورپ کی آٹھ دس مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ پڑھتے رہے ہیں۔ جب تک فیل ہوتے رہے مسلسل شادیاں کرتے رہے پاس ہونے لگے تو بیویوں کو طلاق دیتے گئے۔ چنانچہ فلسفے اور طلاق کی بہت سی ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ یہ تو خیر ذاتی سی باتیں تھیں اگرچہ دفتر کے کہنہ مشق سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی کی رائے میں یہ ذاتی باتیں بھی کچھ کم اہم نہ تھیں۔ بہرحال تشویش کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں نفاست اور فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی ذات میں یہ دونوں چیزیں اس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ ان کی ذات سرے سے گویا موجود ہی نہ تھی نفاست کے ہاتھوں وہ زندگی بھر کوئی کام نہ کر سکے اور فلسفے کے ہاتھوں دو مرتبہ پاگل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور سے اتنا بڑا آدمی سمجھتے تھے کہ دنیا کا ہر کام ان کے لئے چھوٹا ہو کر رہ گیا تھا۔ موجودہ منصب اگرچہ بہت بڑا تھا مگر وہ

حیران تھے کہ انھوں نے اس منصب کو قبول کیسے کر لیا۔ لوگ یوں بھی حیران تھے کہ فولادسازی کے کارخانے میں ایک فلسفی نئیں زادیے کو لا بٹھانے میں آخر کیا تک تھی مگر خیر یہ تو رسوخ کی بات تھی اور ہمارے کارخانے میں رسوخ اتنا چلتا تھا کہ کارخانہ تقریباً بند ہی پڑا رہتا۔

دیوان صاحب جب تشریف نہیں لائے تھے ہم لوگ سوچتے کہ یہ افواہیں غلط ہوں گی۔ یار لوگ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے لیکن آج پہلے ہی سابقے نے واضح کر دیا کہ ان کے بارے میں غلط سے غلط بات بھی درست تھی۔ بلکہ بعض معرکے کی غلط باتوں کا تو ہمیں ابھی علم ہی نہ تھا۔

"تین بجے دوسرا سانحہ پیش آگیا۔ آپ لیکچر دینے آئے تو لیکچر نہ دے سکے۔ چشمہ جیب سے نکالا، چڑھایا، اتارا، گھمایا۔ تین مرتبہ یہی عمل کیا۔ تین چار زاویوں سے لوگوں کو دیکھا اور پھر جیسے ایک دم گھبرا گئے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں اور تیر کی طرح کانفرنس رُوم سے نکل گئے۔ جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے:

"یہ تو ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ آئیے!"

دفتر میں فرمایا:

"وہ لمبی ڈاڑھی والا آدمی کون تھا"

"وہ جو پہلی قطار میں کرسی پر بیٹھے تھے؟"

"کرسی ورسی تو وہاں کہاں تھی، داڑھی ہی داڑھی تھی، مگر ہاں وہی۔"

"جناب وہ ہمارے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی ہیں۔"

"تو گویا داڑھی بھی سنیارٹی کے حساب ہی سے چھوڑ رکھی ہے۔"

"جناب مذہبی شعائر و احساسات کے بارے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"او ہو ہم سمجھ گئے ــــ مگر ان کی ناک بھی تو بڑی واہیات ہے"

میں ہنس پڑا۔

"تم ہنس رہے ہو؟"

"!"

"یہ رونے کا مقام ہے ــــ ناک ہی سے قوموں کی فراست اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

"جی"

"یہ فلسفے کا ایک طے شدہ اصول ہے   کیا آپ نے فلسفہ پڑھا ہے!"

"جی نہیں"

"تاریخ؟"

"میں نے تاریخ ہی میں ایم۔اے کیا ہے"

گویا تاریخ بھی نہیں پڑھی۔ ایم اے تک تاریخ نہیں تاریخ کا کلنڈر پڑھایا جاتا ہے۔ میں فلسفہ تاریخ کی بات کر رہا ہوں، جو بہت بعد کی چیز ہے بلکہ خود انسان کے اندر کی چیز ہے"

"جی"

"بہرحال ناک انسانی کردار کا بنیادی پتھر ہے"

"!"

"سیدھی ناک والی قومیں ہمیشہ فاتح ہوتی ہیں"

"جی"

"اور اوپر کو اٹھی ہوئی ناک والی قومیں ہمیشہ اوپر کو جاتی ہیں"

"بجا"

"چپٹی ناک بھی بری نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک ایک حد میں رہتی ہے تفکر پیدا کرتی ہے"

"جیسے چینیوں کی ناک"

"بالکل، میرا عقیدہ ہے کہ اگر کنفیوشس، چین میں نہ پیدا ہوتا تو شاید پیدا

ہی نہ ہوتا"۔۔۔۔آج کل ان کی ناک کچھ زیادہ پھیل گئی ہے تاہم وہ لمبی پھیلی ہی ہے
ہیں، تم دیکھ لو!"

"درست ارشاد فرمایا"

"مگر یہ نیچے کی طرف کو مڑی ہوئی ناک بھونڈا پن اور نحوست ساری کا سمبل ہے
۔۔۔۔تم ان مولوی صاحب سے کہہ دو کہ اپنی ناک سیدھی کر لیں"

"ناک سیدھی کر لیں"، میں نے اپنی ناک پر رومال پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں یعنی ناک ۔۔۔ سیدھی ۔۔۔ بالکل سکندر یونان کی طرح۔۔۔۔
یا بے شک کچھ اوپر کو اٹھا لیں"۔

"حضور ناک کو . . . . ."

"یا تھوڑی سی چوڑی کر لیں"

"جی! جی!"

"کچھ کر لیں۔۔۔۔مگر یہ قوس بناتی ہوئی اور گھوم پھر کر منہ میں داخل ہوتی ہوئی
ناک۔۔۔۔لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔سخت ناقابلِ برداشت چیز ہے"

"جی"

"یہ ناک نہیں دو نالی بندوق ہے۔۔۔۔آدمی ہی کے لئے نہیں آدمیت کے

"نے بھی"

"!"

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں اس نامعقول چیز کو دیکھ کر بول ہی نہ سکا ——
حالانکہ مجھے بہت کچھ کہنا تھا —— کل ہم سٹاف کو پھر ایڈریس کریں گے"

"مگر حضور........"

"مگر وگر کچھ نہیں - لوگوں سے کہہ دو کہ ناک درست کر کے آئیں —— ہم اونچی
اور سیدھی ناک مانگتے ہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک —— سمجھ گئے!"

"لیکن جناب —— ہمارے دفتر میں تو، میرا مطلب ہے کہ بدقسمتی سے بہت
سی ناکیں........"

"یعنی نیچے کو جھکی ہوئی ہیں"

"کچھ ایسا ہی اتفاق ہے جناب"

"اور گھومتی ہوئی بھی؟"

"جی جی! کچھ ایسی ہی"

"اور قوس بنا کر منہ میں داخل ہوتی ہوئیں؟"

"جی جناب"

"خاموش!"۔۔۔ دیوان صاحب یکبارگی گرج اٹھے۔ ۔۔۔ "ہم یہ سب کچھ نہیں سُن سکتے!۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے!۔۔۔ ہم پاگل ہو جائیں گے!"۔۔۔ اور وہ صبح کی طرح سوچ کے ایک گہرے طویل غوطے میں ڈوب گئے۔

شام کو جب یہ ماجرا معلوم ہوا تو لوگ ناک پکڑ کر بیٹھ گئے۔۔۔ گنتی کی چند ناکیں سیدھی ہوں تو ہوں ورنہ ہر ایک ناک میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور تھا۔ ہر شخص کو ڈر تھا کہ ناک رکھتے ہیں تو ملازمت جاتی ہے لیکن قدرت کو لوگوں کی آزمائش شاید منظور نہ تھی۔ دوسرے دن دفتر میں آنے کے بجائے دیوان صاحب نے اپنا استعفیٰ دفتر میں بھیج دیا جس میں لکھا تھا:

"فولاد کے ستون بنانے سے پہلے لوگوں کی ناک بناؤ!"

مشاعرہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مُرغ بازی —— بٹیر بازی وغیرہ کی طرح مشاعرہ کرانا یعنی مشاعرہ بازی بھی ایک لت ہے، میں خود گذشتہ پندرہ سولہ برس سے اس مرض میں مبتلا ہوں۔ ابتدا میں محض خدمتِ ادب کے خیال سے ایک مشاعرے کی نیو رکھی تھی۔ بعد میں مشاعرے نے گویا اپنی نیو مجھ پر رکھ دی۔ چنانچہ اس مدت میں درجنوں دُبلے پتلے، موٹے تازے مشاعرے کرا چکا ہوں لیکن آج میں مشاعرہ سے توبہ کا اعلان کرتا ہوں اور اپنی اس تحریر کو گواہ بناتا ہوں تاکہ آئندہ اگر مشاعرے کو منہ دکھاؤں تو دنیا کو منہ نہ دکھا سکوں۔

لوگ عام طور پر مشاعرے کو بڑی آسان چیز سمجھتے ہیں حالانکہ آج کل مشاعرے

اور الیکشن میں تھوڑا ہی فرق رہ گیا ہے۔ مشاعرہ ان دنوں کیا نہیں جاتا لڑا جاتا ہے میں نے تو اپنے انتظام کے ہر مشاعرے کے بعد کچھ اس طرح محسوس کیا ہے گویا مشاعرہ نہیں گولکنڈہ کا قلعہ سر ہوا ہے۔ مشاعرے کی مشکل ہی یہ ہے کہ وہ آسان معلوم ہوتا ہے

بعض ممالک کی طرح مشاعرہ بھی ہر وقت خارجی اور داخلی خطروں کی زد پر رہتا ہے اس کی موت "عموماً" داخلی خطروں "یعنی خود شعراء کرام کے ہاتھوں واقع ہوتی ہے۔ کسی انڈو پاک سطح کے مشاعرے میں ظاہر ہے کہ آپ گنتی ہی کے مقامی شعراء کو مدعو کر سکتے ہیں مگر وہاں شہر کا شہر شاعر ہوتا ہے اور شعراء کے بارے میں یہ تو خیر طے شدہ بات ہے کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ بلکہ لہو خورشید کا نکلے اگر ذرے کا دل چیریں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض مشاعروں میں شعراء و سامعین کی تعداد قریب برابر ہوتی ہے۔ یہ مشاعرہ تو نہ ہوا ایک قسم کی "جمہوریت" ہوئی۔ ایسے موقعوں پر مشاعرہ کرنے کے بجائے یہ کہیں بہتر ہو کہ ایک ایک شاعر کو دو دو سامعین کے سپرد کر دیا جائے کہ لیجئے صاحب انہیں اپنے گھر لے جائیے یا پھر مشاعرے کا ایک پورا ہفتہ منعقد کیجئے جس میں شعراء و سامعین زندگی کے تمام کاروبار بند کر کے قومی پیمانے پر مشاعرہ پڑھیں اور سنیں۔

منتخب مقامی شعراء کو آپ یقیناً مدعو کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان کی سواری کا انتظام کرتے ہیں مگر ان میں اکثر کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ گویا مدعو کئے جانے پر خفا ہو گئے ہیں۔ پہلے میٹھے میٹھے گلے، پھر دھیمی دھیمی شکایتیں اور آخر کار تند و تیز اختلافات حتیٰ کہ مشاعرے کے قریب قریب صرف چند جاں نثار شعراء ہی میدان میں رہ جاتے ہیں۔ صورت حالات کچھ مغلوں کے عہدِ زوال کے ہندوستان کی سی ہوتی ہے کبھی دکن میں شورش، کبھی مالوہ میں بغاوت، کبھی ملتان میں فساد ـــــ اختلافات کچھ اس نوع کے ہوتے ہیں۔

۱۔ پوسٹر میں میرا نام باریک قلم سے لکھا گیا ہے۔

۲۔ میرا نام فلاں صاحب کے بعد لکھا گیا ہے۔

۳۔ فلاں صاحب مدعو کئے گئے ہیں۔

۴۔ فلاں صاحب مدعو نہیں کئے گئے۔

۵۔ میں موٹر میں کسی دوسرے کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔

۶۔ اچھا آپ نے مجھے مقامی شاعر سمجھ لیا؟

۷۔ انجمن ضیاء الادب کے سب شعراء کی شرکت ضروری ہے (اور ان کی گنتی ڈیڑھ سو سے اوپر ہے)

۸ - میں نے ۲۵ اعزازی کارڈ طلب کئے تھے۔

۹ - میں طرحی مشاعرے کا قائل نہیں۔

۱۰ - میں غیر طرحی مشاعرے کا قائل نہیں۔

۱۱ - میں مشاعرے ہی کا قائل نہیں۔

الغرض آخر دم تک کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون صاحب آ رہے ہیں، کون نہیں لیکن جب پتہ چلتا ہے تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جو اصحاب و ٹوک معذرت کر چکے تھے ان میں سے بیشتر تشریف لے آئے ہیں اور جن کی شرکت یقینی تھی ان میں سے اکثر کا کوئی سراغ نہیں۔

اس آنے کو کیا کہیئے اس جانے کو کیا کہیئے

بیرونی اسٹار شعراء کے اپنے پرابلم ہیں۔ پہلے تو ان کے انتخاب پر خود انتظامیہ کمیٹی کے اندر وہ ہنگامہ بپا ہوتا ہے کہ عموماً انتظامیہ کمیٹی ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ جو مشاعرہ اس مرحلے سے بچ نکلا وہ مشاعرے سے زیادہ ترنم اور تحت اللفظ سامعین اور مائیکروفون کارکنوں اور سرپرستوں اور نہ جانے کن کن مجبوریوں اور مصلحتوں کے درمیان ایک عجیب و غریب مجموعہ ہوتا ہے۔

شعراء سے خط و کتابت بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ ان خطوط

سے اپنے دور کی ایک نہایت قیمتی سوانحی دستاویز مرتب کی جا سکتی ہے مثلاً

۱۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔

۲۔ میں غروب آفتاب کے وقت کافی پیتا ہوں۔

۳۔ میں سالن میں مرچیں تیز کھاتا ہوں۔

۴۔ میں "کریون اے" کے سگرٹ پیتا ہوں۔

۵۔ کیا لبرٹ ساتھ لانا ہوگا؟

۶۔ مجھے چھٹی دلانے کے لئے پنڈت نہرو کو فون کیجئے۔

میں سمجھتا ہوں مشاہیر کے بارے میں اس قسم کی باتیں ضبطِ تحریر میں آ جانی چاہئیں کہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بعد میں تاریخی باتیں بن جاتی ہیں۔ مگر افسوس ان باتوں کو وہ انکشاف لکھنے کی ہمیں جرات نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خط و کتابت سے آپ بیرونی شعراء کے تمام پرابلم طے کر سکتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو مشاعرہ کرانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شعرا نہ خود تفصیل سے لکھتے ہیں نہ دوسروں کی تفصیل پر توجہ دیتے ہیں۔ لہٰذا آپ خواہ کچھ کریں بعض پرابلم بنفسِ نفیس شاعر کے ساتھ ہی وارد ہوں گے۔

آپ جناب سیمابی اور جناب تمنائی کو بصراحت لکھ چکے تھے کہ پروگرام میں

گڑبڑ ہو تو آپ سیدھے میٹرو پول ہوٹل میں تشریف لے آئیں جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے وہاں آپ کے لئے کمرہ مخصوص ہے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا مگر سینائی تمنائی کا کوئی پتہ نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں وہ تشریف نہیں لائے۔ اتنے میں خبر ملتی ہے کہ سینائی صاحب باہر گیٹ پر کھڑے ہیں اور دو تانگوں میں سامان لدا ہے۔ پھر کوئی صاحب فون کرتے ہیں کہ تمنائی صاحب گلی مائی تابو میں ذکی الدین صاحب کے ہاں فروکش ہیں۔ ادھر آپ کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ گلی مائی تابو کہاں ہے اور ذکی الدین صاحب کون بزرگوار ہیں۔

شباب صاحب مشاعرے سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ تو گئے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ابھی حجامت بنوانی ہے۔ شیروانی پر استری کروانی ہے قمیص ہرے سے سامان ہی کوئی لائے ہی نہیں اور ہاں طرحی غزل میں مصرع طرح کے سوا فی الحال کچھ کہہ بھی نہیں سکے۔

بعض لوگ دا گرچہ بہت شاذ) تعجیل کے پرابلم پیدا کرتے ہیں۔

مشاعرے میں چھ سات روز باقی ہیں آپ رات کے دس بجے باہر سے گھر لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ برآمدے میں بکسوں، گٹھڑیوں اور بوریوں کا انبار لگا ہے اور ڈرائینگ روم میں تین چار اجنبی آدمی بیٹھے چلغوزے کھا رہے ہیں۔

"خاکسار کو نغمہ قرطاس پوری کہتے ہیں۔"

"اخاہ! ——— نغمہ صاحب" اور آپ ان سے لپٹ جاتے ہیں کیونکہ اگر آپ ان سے نہیں لپٹیں گے تو وہ آپ سے لپٹ جائیں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ نغمہ صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ نہ ان کا فوٹو ہی کبھی دیکھا تھا۔ کیونکہ نغمہ صاحب مشاعرے کے ان استادوں میں سے ہیں جن کو ادبی رسائل کے ایڈیٹر چھاپنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ بہرکیف نغمہ صاحب تشریف لے آئے تھے۔ معلوم ہوا پچھلے اتوار اوکاڑہ میں مشاعرہ تھا۔ انھوں نے سوچا لاؤ پابہ رکاب دوسرا مشاعرہ بھی بھگتا آؤ۔ احباب (؟) سے ذرا گپ شپ ہی رہے گی اور یہ دو تین صاحبان، نغمہ صاحب کے سخن فہم دوست ہیں۔ جن کو آپ زبردستی گھسیٹ لائے ہیں۔ ویسے وہ بنولوں کی آڑھت کرتے ہیں۔ چنانچہ "نمونے" کی بوریاں باہر برآمدے میں پڑی ہیں۔

جو شعراء پروگرام کے مطابق پہنچ چکے ہیں اور آپ کو اطمینان ہے کہ وہ آپ کے قابو میں ہیں۔ ان میں سے اکثر ٹھیک مشاعرے کی شام کو بے قابو ہو کر گھومنے نکل جائیں گے۔ کہاں گئے؟ کب واپس آئیں گے کچھ معلوم نہیں۔ واپس آئے تو بعض اس حالت میں ہیں کہ اب آپ مشاعرے ہی کو ان تک لے آئیں

ورنہ وہ تو سُود و زیاں، ہوش و خرد بلکہ زمان و مکان اور ہستی و نیستی وغیرہ کی منزلوں سے بھی گویا بہت آگے نکل چکے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ سیکرٹری بچارے نے زیادہ تر چاروناچار اسمبیٹ کر یا پھر ان چند شعراء کے آسرے پر مشاعرہ شروع کر دیا جن سے ابھی تک مشاعروں کی کچھ ساکھ باقی ہے۔ دوسرے شعراء رفتہ رفتہ جیسے جیسے کوئی ملتا گیا شروع سے آخر تک ایک ایک کر کے 'قطرہ بہ قطرہ' مشاعرے میں پہنچتے رہے۔

بعض شعراء وقت کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خوب جما ہوا مشاعرہ جب تک ان کی آمد کے غلغلے میں درہم برہم نہ ہو وہ اپنی آمد ہی کو بے معنی سمجھتے ہیں یہ اصول گویا عروض کے مسلمات میں سے ہے کہ جتنا بڑا کوئی شاعر ہے اتنی ہی دیر سے وہ مشاعرے میں پہنچے۔ یہاں مجھے بے اختیار علامہ بیتاب یاد آجاتے ہیں یاد کیا آجاتے ہیں میں ان کو بھول ہی نہیں سکتا کیونکہ وہی تو دراصل مشاعرہ بازی سے میری توبہ کا باعث ہوئے ہیں تو ایک طرح سے ان کا احسان مند ہوں بلکہ ایک میں کیا جملہ سامعین کو بھی ان کا شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کم از کم اس شہر میں کوئی مشاعرہ ہو بھی سکے گا۔ یہ نکتہ قدرے تفصیل چاہتا ہے۔ مشاعرے میں اجمال کا کیا کام؟

علامہ ہیبت ہمارے مشاعرے کے سب سے بڑے شاعر تھے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارے شہر میں آرہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر ان سے واقف نہ تھا۔ البتہ ان کی نازک مزاجی، غصہ وری اور بددماغی سے متعلق طرح طرح کی ہولناک روایات ضرور مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے ان کو مدعو کر لینا کوئی کمال نہیں ہاں ان کو سنبھال کے رکھنا واقعی ایک کارنامہ ہے — بعض لوگ اعداد و شمار سے ثابت کرتے کہ ان کی شرکت کی بدولت جتنے مشاعرے برباد ہوئے ہیں اتنے کامیاب ہرگز نہیں ہوئے۔ ہمیں ان باتوں کا یقین نہ آتا جیسی جیسی نازک مزاجیاں ان سے منسوب کی جارہی تھیں اس زمانے میں ایسے شخص کا ساٹھ برس تک زندہ رہنا ہی محال تھا مگر لوگ بھی سچ ہی کہتے تھے۔

پوری مجلسِ انتظامیہ علامہ کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ علامہ تشریف لائے تو ایک ملازم کے علاوہ دو مصاحب بھی ان کے ہم رکاب تھے جن کی ہمیں کوئی اطلاع نہ تھی۔ ویسے صورت و حیثیت میں یہ دونوں مصاحب ککن نواب اور نبھو مرزا ان کے ملازم سے کچھ بہتر نہ تھے۔ بہر حال پہلے بڑھ کر میں نے اپنا تعارف کرایا پھر کمیٹی کے دوسرے ارکان کو علامہ کی خدمت میں پیش کیا۔

"مسٹر اعجاز علی ٹرانسپورٹ افسر"

"خوب"

"مسٹر علی حیدر فارسٹ افسر"

"خوب"

"خواجہ مصباح الدین میونسپل کمشنر"

"خوب"

"میجر ڈبلیو، زیڈ خان نائب صدر"

"خوب، اور آپکے صدر کون ہیں"؟ علامہ نے دریافت فرمایا۔

"کمشنر صاحب" ہم نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

"تو کمشنر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ دورے پر ہیں" میجر خان فوراً بولے۔

"دورے پر!؟" علامہ چونک کر بولے "کیا وہ مشاعرے کی صدارت نہیں کر رہے؟"

"صدارت تو کر رہے ہیں مگر وہ کمشنر بھی ہیں" میجر خان نے جن کو اس سے پہلے کبھی کسی مشاعرے سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"مگر میں اس توہین کا عادی نہیں ہوں" علامہ بھڑک اُٹھے۔

"قبلہ مجبوری تھی۔ اچانک ایک اہم سرکاری کام نکل آیا" میں نے خیرسگالی کے مشن پر ایک جملہ بھیجا" ویسے شام کو وہ نہیں ہوں گے"

"کچھ بھی ہو۔ ہماری طبیعت مکدر ہو چکی ہے۔ بخوردار سامان اسی گاڑی میں رکھ دو۔ ہم یہاں نہیں اتریں گے"

یہ سن کر ہمارے قدموں تلے سے گویا پلیٹ فارم ہی نکل گیا وہ تو یہ کہیے کہ اس موقع پر میونسپل کمشنر صاحب جو سینکڑوں انتخابی معرکوں میں سے نکلے ہوئے تھے کام آ گئے اور انھوں نے منت سماجت کر کے علامہ کو راضی کر لیا ورنہ علامہ ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گئے تھے۔

ہوٹل میں پوری مجلس انتظامیہ ان کی خدمت میں حاضر رہی۔ شام کو ہم لوگ جوائنٹ سیکرٹری عابد کو ان کی خدمت میں چھوڑ کر پنڈال میں آ گئے۔ میں علامہ کو خطوط میں لکھ چکا اور اب بھی عرض کر آیا تھا کہ آپ نو بجے تشریف لائیں گے۔ میں جانتا تھا کہ میں نو کہوں گا تو وہ کہیں دس بجے آئیں گے۔ بخود ہمارا ارادہ بھی مشاعرے کو نو بجے ہی شروع کرنے کا تھا مگر کمشنر صاحب نے وقت کی پابندی ضروری سمجھی اور اعلان کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے مشاعرے کی کارروائی شروع کر دی۔ نو بج گئے دس بج

گئے مگر علامہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اتنے میں ہوٹل سے ایک آدمی میرے نام پیغام لایا کہ تم فوراً پہنچو علامہ خفا ہو گئے ہیں۔ میں پہنچا تو عابد پورچ میں کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک تو علامہ اور معاحبین خوب دھواں دھار کافی پیتے رہے اور نہایت اچھے موڈ میں تھے۔ پھر میں ان کا ڈنر لگوانے گیا۔ واپس آیا تو انھوں نے کہا کہ سرکار نے ہدایت کی ہے کہ بارہ بجے سے پہلے ان کو ہرگز نہ جگایا جائے میں نے سوچا بارہ بجے تو ادھر کمشنر صاحب مشاعرہ ہی برخاست کر دیں گے۔ لہٰذا پونے دس بجے میں نے خود ہی ہمت کر کے ان کو جگا دیا کہ حضرت ڈنر تیار ہے مگر اس پر وہ سخت برہم ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں میں مشاعرے میں جاتا ہی نہیں۔

"قطعی انکار؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی طرف سے تو یہی معلوم ہوتا ہے؟" عابد بولا۔ "البتہ کلن نواب کہہ رہے تھے کہ اگر سیکرٹری صاحب خود آجائیں تو شاید بات بن جائے۔"

"اچھا اب میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔ تم یوں کرو کہ تھوڑی سی اور کافی بھجوا دو۔"

"اور کافی؟" عابد حیران ہو کر بولا "کافی ہی نے تو......"

"تم نہیں سمجھتے ---- درد کا حد سے گذرنا ہے......"

میں کمرے میں پہنچا تو علامہ تکئے کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹے ہوئے پلنگ پر دراز تھے۔ میں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے قبلہ؟"

قبلہ نے یہ سُن کر کروٹ لی اور منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

"سیکرٹری صاحب تشریف لائے ہیں سرکار" بنجو مرزا نے سفارش کی۔

"ہوں" سرکار دیوار ہی کی طرف سے بولے "معاف فرمائیے سیکرٹری صاحب جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا"

"جی ہاں معاف فرمائیے" کلن نواب بولے "اب چڑیاں چُگ گئیں کھیت"

"مگر کچھ معلوم تو ہو قبلہ؟"

"کیا ابھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟" قبلہ منہ پھیرتے ہوئے بولے "سیکرٹری صاحب آپ کے جوائنٹ سیکرٹری صاحب نے سرِ شام ہی مجھے بیدار کر دیا"

"مجھے بڑا افسوس ہے"

"ایسا تکدر تو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے طبیعت میں" بنجو مرزا بولے۔

"میں بہت شرمسار ہوں آپ سے"

"ہم ان سے کہتے بھی رہے کہ سرکار بارہ بجے تک آرام فرمائیں گے، مگر . . . ."

"مجھے بحد افسوس ہے مگر قبلہ دراصل اس بے چارے کا بھی گناہ نہیں ہم لوگ مشاعرہ آٹھ بجے شروع کر کے بارہ بجے ختم کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔"

"سبحان اللہ! یہ عجیب مشاعرہ ہے جو بارہ بجے ختم بھی ہو جائے گا۔ اور سنو بھئو مرزا"

"مشاعرہ تو بارہ بجے جا کر کہیں شروع ہوتا ہے" مرزا نے گرہ لگائی۔

"بجا فرمایا، مشاعرہ تو واقعی بارہ بجے شروع ہوتا ہے لیکن . . ."

اتنے میں بیرا کافی لے کر آ گیا اور میں نے ایک پیالہ بنا کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"قبلہ آپ تھوڑی سی کافی نوش فرمائیں۔ میں آپ کے چہرے پر بھی تکان کے آثار دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر علامہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دو گھونٹ لینے کے بعد انھوں نے پاؤں فرش پر رکھ دیئے اور تنتیسرے پہر بولے۔

"مجھے تو دس بجے بھی چلنے میں کوئی عذر نہ تھا لیکن بعض نامعقولیتوں کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"جی۔"

"اور حضرت کیا وہ آپ کے کمشنر صاحب بھی تشریف لائے ہیں یا دو سرے ہی پو ہیں؟"

"جب میں آیا ہوں اس وقت مشاعرہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس وقت کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟" قبلہ نے دریافت فرمایا۔

"قبلہ وہ تو صرف آپ ہی کو سننے کے مشتاق تھے۔"

"تو گویا سخن دوست انسان ہیں۔"

"آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ کل دوپہر کو آپ کے لنچ کے لئے بھی کہہ رہے تھے۔"

"تو کیا کہتے ہو برخوردار؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں قبلہ ویسے لوگوں کو سخت مایوسی ہو گی۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" علامہ یکبارگی اچھل پڑے۔ "بھئی مجھ سے لوگوں کی

مایوسی نہیں دیکھی جاتی۔"

ننھو مرزا میری شیروانی، ٹوپی، جوتا.......

میں سمجھا اب میدان مار لیا۔ لیکن تیار ہونے کے بعد علامہ نے ایک خاص ادائے بے نیازی کے ساتھ تین چار بیاضیں ننھو مرزا اور کلن نواب کے سامنے پھینک دیں کہ تو بتاؤ کون کون سی غزل رہے اور اب غزلوں کے انتخاب پر جو بحث چلی ہے تو قصہ کوتاہ جب میں علامہ کو لے کر پنڈال میں پہنچا ہوں تو ایک بج گیا تھا۔ کمشنر صاحب مشاعرے کو ایک پرنسپل صاحب کے سپرد کر کے تشریف لے جا چکے تھے اور پرنسپل صاحب بپھرے ہوئے سامعین کے نام بار بار امن کی اپیلیں جاری کر رہے تھے اور سامعین چلا رہے تھے۔

"ہمارے پیسے واپس کرو!"

"ہمارے پیسے واپس کرو!"

بدقسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ علامہ کو دیکھنے کے بعد بھی سامعین بدستور بپھرے رہے۔ کیفیت یہ تھی کہ علامہ مطلع پڑھ رہے ہیں کہ ——— یاروں کے لئے گردشِ ایام بہت ہے ——— اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں کہ:۔

"ہمارے پیسے واپس کرو!"

"ہمارے پیسے واپس کر دو!"

دراصل ریلوے اسٹیشن پہ علامہ کے روٹھنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے ڈاڑھی مونچھ پر رام پوری ٹوپی رکھ کر کوئی نقلی آدمی کھڑا کر دیا ہے۔ سب سے مزے دار لطیفہ مشاعرے کے بعد اس وقت ہوا جب نبھو مرزا نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب مبارک ہو۔ خدا کی قسم یہ تو معجزہ ہوا ہے جو سرکار مشاعرے میں تشریف لے آئے۔"

اور میجر ڈبلیو، زیڈ خان نے جو پاس ہی پائپ روشن کر رہے تھے زور کا ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"مائی گاڈ —— واٹ اے فنی لاٹ ہول آف دیم"

O

پروفیسر طاؤس

بعض لوگ اپنے زمانے سے بہت پہلے اور بعض بہت پچھڑ کر پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی میں دونوں کا حشر عبرت ناک ہوتا ہے البتہ پہلے پیدا ہونے والے مرنے کے بعد کبھی کبھی پہچان لئے جاتے ہیں۔

پروفیسر طاؤس دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اپنے زمانہ سے کوئی تین چار زمانے پچھڑ کر پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ زمانے سے ان کی اور ان سے زمانے کی صورت پہچانی نہیں جاتی۔

عمر ایسی زیادہ نہیں ہے البتہ ذہنی اعتبار سے سترھویں صدی کے کسی

نقطے پر بیٹھے ہیں۔ آپ دراصل ان لوگوں میں سے ہیں جن کو "پیدائشی بالغ" کہنا چاہیئے۔ ایک خاص قسم کی بزرگی سرشت میں لے کر پیدا ہوتے ہیں، اس کی سنجیدگی اور تقدس کو اپنے اوپر طاری رکھتے ہیں اور احترام کو بھیک کے طور پر طلب کرتے ہیں۔

فارسی کے اتنے بڑے فاضل ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور پڑھنا کبھی برداشت نہیں کیا۔ ابتدا میں جب ابھی ملازمت سے پہلے انٹرویو کی بدعت کا رواج نہ تھا آپ ایک کالج میں پروفیسر بھی ہو گئے تھے لیکن ان کو طلبا کے لچھن اور طلبا کو ان کی صورت پسند نہ آئی۔ تب سے اپنے مکان ہی پر "جامعہ تہذیب وفن" کے نام سے درس و تدریس کا ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ فارسی پڑھاتے ہیں اور اُردو میں شعر کہتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر شعر ہی کہتے ہیں کیونکہ "جامعہ تہذیب وفن" جس کے باہر آپ نے نصب العین کے طور پر یہ مصرع لکھ رکھا ہے کہ:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

واقعی پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے!

پروفیسر طاؤس کو ہر قدیم چیز سے عشق ہے۔ وہ یہ عقیدہ لے کر پیدا ہوئے ہیں کہ فن تہذیب ادب اغرضیکہ پوری انسانی زندگی سترھویں صدی میں نقطۂ عروج کو پہنچنے کے بعد اب نیچے کی طرف آرہی ہے۔ نئی سائنسی ایجادات نے ان کے نزدیک

زندگی کو آسان کر دیا ہو تو کر دیا ہو مگر وہ چیز چھین لی ہے جس کو زندگی کا جوہر یا شرف کہتے ہیں - اور جو ہر و شرف کی اس فہرست میں آپ نے چن چن کر ہر وہ چیز داخل کر رکھی ہے جو مدت ہوئی زندگی سے خارج ہو چکی ہے۔

یہ محض نظریہ ہی نہیں انھوں نے اپنی پوری شخصیت پر اس کی چھاپ بھی لگا رکھی ہے۔ سر کے بال اس طرح بڑھتے لٹکتے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ گویا ——— بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے! ——— بھری بھری ڈاڑھی پھیلی پھیلی مونچھیں آپس میں کسی بین الاقوامی تنازعے کی طرح الجھی ہوئی ہیں - ایک جھنڈ ہے جو کہیں ڈاڑھی کہیں مونچھ ہو گیا ہے ——— سر پر بھاری پگڑ باندھے ہیں مگر اس کے ساتھ لباس اتنا سبک لطیف کہ پہننے سے پہلے آدمی کے قابو ہی میں نہ آئے اور پہن لو تو آدمی اس کے قابو میں نہ آئے۔ ان کے گھر جائیے تو شبہ گذرتا ہے کہ آپ کسی فلمی اسٹوڈیو میں بیٹھے ہیں جہاں سترھویں صدی کی گھریلو معاشرت کا کوئی منظر نصب ہے۔ تصویروں کی طرح گھر کا دوسرا سامان بھی صرف دیکھنے ہی کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ کرسی ہے تو اس وضع کی کہ آپ اس پر تاج پوشی کی رسم تو ادا کر سکتے ہیں بیٹھ نہیں سکتے۔ لوٹے ہیں تو ان کی صراحی دار گردنوں میں سے "پرچۂ ترکیب استعمال" کے بغیر پانی نکل ہی نہیں سکتا ——— لب و لہجہ

گا رکھ رکھاؤ اس درجہ پر کہ نہ معلوم بیوی بچوں سے پیار کس طرح کرتے ہوں گے؛

ادب و شاعری کا بھی یہی مضمون۔ شاعری کو وہ ایک چشمہ سمجھتے ہیں جس کی حفاظت اس شدت سے کر رہے ہیں کہ اب وہ چشمہ ہی سوکھ گیا ہے۔ اگرچہ یہ سوکھنا بھی شاعرانہ قسم کا ہے۔ ؎

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

فن موجود شعر مفقود۔ محاورہ حاضر زندگی غائب!۔۔۔ قدیم رنگ سخن پر جان چھڑکتے ہیں مگر قدامت اس بلا کی کہ عموماً ہر شعر کا قوام دل، جگر، گردے وغیرہ سے تیار کرتے ہیں۔ بعض نقادوں کا قیاس ہے کہ اگر ان کے شعر کو ہتھیلی میں بند کر کے سختی سے نچوڑ دیے جائیں تو کچھ عجب نہیں کہ خون کی بوندیں نچڑ کر باہر جا پڑیں۔ اصل جوگ قدامت کا بھی نہیں معنی و مضمون کی باریکی کا ہے معنی و مضمون کو وہ سامنے سے نہیں، پیچھے سے جا کر پکڑتے ہیں یعنی بگلے کو سر کے سر پر موم رکھ کر پکڑنے کے قائل ہیں۔ عموماً یہ بگلہ موم سمیت اڑ جاتا ہے۔

آپ شعراء سے ملے ہوں گے۔ لیکن فن میں ان کا سا انہماک کسی میں نہ دیکھا ہو گا۔ پروفیسر طاؤس چوبیس گھنٹے کے شاعر ہیں۔ آپ کو شاعر کے بجائے اگر "شاعری" کہا جائے تو شاید زیادہ درست ہو۔ شاعری سچ مچ ان کا اوڑھنا

بچھونا ہے۔ "فاعلاتن" میں کھانسے اور "مفاعیلن" میں کھانستے ہیں۔ جب سے بڑھاپے نے آلیا ہے "مفاعیلن" ان کو کھانسنے لگا ہے۔

کم یا زیادہ اپنا کلام سنانے کا ہر شاعر کو شوق ہوتا ہے۔ ان کے اس شوق کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ زندگی میں کسی اور شوق کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی۔ وہ یا شعر کہہ رہے یا سنا رہے ہوتے ہیں، کسی تیسرے کیفیت میں ان کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک روایت کے مطابق بیوی سے بھی اسی بنا پر نباہ نہ ہو سکا۔ الفاظ کے تلفظ مخزن اور مخرج، نکات و معانی، مطلعوں اور مقطعوں نے رفتہ رفتہ مستقل خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ راوی کا بیان ہے کہ بیوی نے ایک روز جل کر ان کی ایک رباعی چولھے میں جھونک دی اور

اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

"کہنے" کا حجم اتنا ہے کہ اگر بیاضوں کو ایک پلڑے میں اور گھر کے باقی جملہ سامان کو دوسرے میں رکھ دیا تو شاعری والا پلڑا بھاری رہے۔ آپ شاید مبالغہ سمجھیں مگر واقعہ ہے کہ دس دس، پندرہ پندرہ سیر کے کوئی پندرہ بیس بیاض اس مبالغہ آمیز شاعری سے لبالب بھرے ہیں۔ غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ رباعی قطعہ وغیرہ ایک ایک صنف کی الگ الگ کئی کئی بیاضیں ہیں۔ چند بیاضوں میں تو صرف

استعارے، تشبیہیں، محاورے اور روز مرّے سب ہی درج ہیں۔ ایطائے جلی و خفی، شتر گربے وغیرہ کو علیحدہ قلم بند۔ یا یوں کہیئے کہ نظر بند کر رکھا ہے مبادا کھل کر ان کی شاعری میں آ گھسیں۔ کچھ بیاضیں الماری میں رکھی ہیں۔ کچھ ہر وقت بستر پر سرہانے پائینتی پڑی ہیں زیادہ تر اندر ایک صندوق میں مقفل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کمرے میں آپ جس قمیص کو ہلائیں، تکیئے کو اچھالیں، کپڑے کو جھاڑیں، اگالدان میں جھانکیں، لوٹے میں ہاتھ ڈالیں ایک آدھ تازہ غزل ضرور ہاتھ آجائے گی۔ حد یہ ہے کہ شیروانی کے بٹنوں تک پر ردیف اور قافیے لکھے ہوئے پائے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان کا "سنانا" بھی "کہنے" ہی کے حساب سے ہو گا اور ہے۔ "سننے والے" بیشتر احباب ہیں تو بعض سننے والوں کے بقول وہ شاید مہینوں لگاتار سناتے چلے جائیں۔ لوگ ان سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے لیکن اپنے اس شوق کے صدقے میں دنیا میں بالکل یک و تنہا رہ گئے ہیں۔ لوگ دوست بننے ان کے پاس جاتے ہیں، دشمن بن کر اٹھتے ہیں!

سچ یہ ہے کہ ان کا کلام سننا بھی ایک آزمائش۔ ایک تو شعر ایسا بے جان لکڑی یا ٹین کا بنا ہوا کہ نہ مسکراتا ہے نہ دھڑکتا۔ اس پر گویا "شاعری کا طوفانِ نوح"

کوئی سنے تو کیونکر، کہاں تک؛ اس پر یہ ستم ظریفی کہ مصرع کے ایک ایک رکن پر ٹھہر ٹھہر، جھجم کر حرف حرف کے محاسن پر گفتگو کرنا، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر داد طلب کرنا؛ — میں بارہا اس ابتلا میں مبتلا ہوا ہوں اور ایک آدھ غزل سننے کے بعد ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ جیسے میں کسی حمام میں بند ہوں اور تین چار مالش کرنے والوں نے مجھے گرا رکھا ہے۔ یا پھر حجام بال کاٹ رہا ہے اور میرے لئے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ان کے شعر میں شعریت تو خیر اتنی ہی ہوتی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں البتہ سنانے کے انداز میں شوق۔ بے چینی۔ التجا اور مطالبے کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت ہوتی ہے کہ آپ درمیان میں معذرت کر کے اٹھنا چاہیں تو ممکن ہے کہ ان کی حرکتِ قلب بند ہو جائے!

مشاعرے میں ان کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر اس بات کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ شہر میں کوئی مشاعرہ ہو اور آپ اس میں موجود نہ ہوں۔ اکثر منتظمین انھیں صرف اس خیال سے مدعو کرتے ہیں کہ سب سے آخر میں ان سے کلام پڑھوا کر مشاعرہ آسانی سے برخاست کر سکیں۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ ادھر آپ کلام سنانے اٹھے اور ادھر پورے کا پورا مشاعرہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مشاعرے کو آپ اگر فی نفسہٖ عبادت نہیں تو کم از کم زندگی کا کوئی اہم مشن یا بنیادی تسکین ضرور

سمجھتے ہیں۔ اس میں شرکت کا اہتمام نماز عید میں شرکت کے اہتمام سے کم نہیں ہوتا۔ شام کا مشاعرہ تڑکے ہی ان پر سوار ہو جاتا ہے۔ غسل ہو گا۔ نیا جوڑا نکلے گا۔ سرمہ لگے گا ——— عطر لگایا جائے گا اور زلفوں اور مونچھ ڈاڑھی کے جھنڈ کی ترتیب پر خیر کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر الماری صندوق وغیرہ سے بیاضیں نکال کر چاندنی پر ڈھیر کر دی جائیں گی۔ ایک ایک بیاض سے طویل تانکا جھانکی کے بعد اُن میں سے آٹھ دس بیاضیں چھانٹ کر الگ کر لی جائیں گی۔ کہ نہ معلوم وہاں کیسی اور کیسی کیسی فرمائشوں سے سابقہ ہو۔ شام کو بیاض بردار شاگردوں کے ایک پورے جلوس کے ہمراہ اس شان سے مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہوں گے کہ گویا فوجداری کا کوئی بڑا نامی وکیل تخیل کا مقدمہ لڑنے جا رہا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ان کو مشاعرے کے لئے تیار ہوتے دیکھا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ انھوں نے عمر عزیز کا نصف حصہ مشاعروں کی تیاری کی نذر کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ نہ معلوم وہ اس مدت میں اور کتنی بیاضیں کھڑی کر دیتے!

پہلے پہلے مجھے ان کی اس ثابت قدمی پر سخت حیرت ہوتی کہ مشاعرے میں ایسی واشگاف بھرپور دل توڑنے والی ناکامی کے بعد وہ کس طرح دوبارہ

جوش و خروش، اشتیاق و آرزو مندی کے ساتھ مشاعروں میں شرکت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے اس ناکامی ہی کو کامیابی کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ وہ پڑھ رہے ہوں اور لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیرت اور بے بسی، سراسیمگی اور پشیمانی کے ساتھ گم سُم ان کی طرف دیکھتے رہیں بلکہ بے شک اُٹھ کر چلے بھی جائیں، تو ان کا فن کامیاب شعر فائز المرام! ——— وہ اکثر خود کہا کرتے ہیں کہ جس روز ہر نتھو خیرا میرے اشعار کے باطنی حسن اور معانی کی تہ داری کو سمجھنے لگ گیا میں شعر کہنا ہی ترک کر دوں گا ——— چنانچہ ہر ناکامی کے بعد وہ اپنی فتح و عظمت پر ایک تازہ اعتماد لے کر واپس آتے ہیں۔ تعجب نہیں اگر اس پر شکرانے کے نفل بھی ادا کرتے ہوں! ——— سُنا ہے آج کل وہ اپنی اس ناکامی یعنی "کامیابی" کی گولڈن جوبلی منانے کی فکر میں ہیں!

○

حکیم سینا

یہ ان مشہور حکیم بو علی سینا کا تذکرہ نہیں جو علم طب کے امام مانے گئے ہیں جن حکیم سینا کا تذکرہ میں کر رہا ہوں اگرچہ ویسے خود وہ بھی اپنے آپ کو وقت کا بو علی سینا ہی سمجھتے تھے مگر عملاً ہمارے شہر کی ایک ایسی تنگ و تاریک پتلی سی گلی میں مطب کرتے تھے جہاں طبیب و مریض تو بڑی چیزیں ہیں بہ نفسِ نفیس علم طب کا گزر بھی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن انسان وہ مخلوق ہے کہ جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو ایک شاعر کے بقول، ؏

سمندر چیرتا ہے کوہ سے دریا بہاتا ہے

اور جب ایک دوسرے شاعر کے بقول. کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا. تو اس گلی میں مطب تک کر لیتا ہے۔ ع

جینا اسی گلی میں مرنا اسی گلی میں

طبیب کی حیثیت سے حکیم سینا کی شہرت صرف اسی قدر تھی کہ وہ تقریباً اسّی نوّے برس تک زندہ رہے. شہرت سے زیادہ لوگوں کو ان کی سخت جانی پر حیرت تھی کہ جس تنگ دستی مگر پھر جس وضع داری کے ساتھ انھوں نے زندگی بسر کی ہے، وہ اتنی مدّت تک زندہ ہی کیونکر رہ سکے تھے. محلّے کی طرف سے کمیٹی کے ہنسوڑ ممبر بابو مولا داو سیاہ نویس اکثر کہا کرتے تھے کہ حکیم سینا اگر اسی گلی کے نکڑ پر خوانچے میں مونگ پھلی لے کر بیٹھ جاتے تو زیادہ آسودہ ہوتے مگر حکیم صاحب تھے کہ جہاں ایک مرتبہ بیٹھ گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پچھلی صدی کے چوتھے یا تیسرے رُبع میں ان کے والد مرحوم جو عطاری کا دھندا کرتے تھے جہاں ان کو بٹھا گئے تھے وہ پھر وہاں سے اٹھے نہیں. آخر آخر میں تو خیر کئی سال سے بذاتِ خود ان کا جینا ہی صحیح معنوں میں بے معنی ہو چکا تھا مگر بھلے دنوں میں بھی اہل الرائے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حکیم سینا اور امام مسجد مولوی لطف اللہ خلل علی الترتیب حکمت و امامت کے علاوہ کوئی دوسرا دھندا کر ہی نہیں

سکتے۔ مولوی لطف اللہ خاں تو نسبتاً پھر بھی آسودہ حال تھے مگر حکیم صاحب کا حال ساری عمر یہ رہا کہ محلے کی بوڑھی خوش عقیدہ عورتوں کو جب کبھی اللہ کی رزاقی و قدرت پر گفتگو مقصود ہوتی تو مثال کے طور پر وہ پتھر کے سینے میں جینے والے کیڑے اور اندھی گلی میں مطب کرنے والے حکیم سینا کا تذکرہ عموماً ایک ہی سانس میں کیا کرتیں۔

حکیم سینا میری طفلی ہی کے زمانے میں، جس کو آج پچیس تیس برس گذر چلے ہیں، اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں کوئی آدمی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد محض ایک رائے، چرچا مشغلہ یا قہقہہ رہ جاتا ہے۔ ہمارا شہر کچھ اس قسم کا ہے جہاں ہر شخص ہر شخص کو جانتا ہے بلکہ لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسب تک سے واقف ہیں۔ چنانچہ شہر کا ایک معروف و معزز شخص جو وزیر تک رہ چکا ہے اب تک میاں حشمت علی ماشی ہی کہلاتا ہے۔ یہ دراصل ایک بڑا قصبہ ہے جس کو زرعی ملک کی سیر چشمی نے شہر کا نام دے رکھا ہے۔ حکیم سینا کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا بلکہ بڑوں کو چونکہ مدت سے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے شہر کے بچے ان کو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مجھے جس وقت ابھی یہ تمیز بھی نہ تھی کہ طبیب کسے کہتے ہیں اور مطب کیا ہوتا ہے، یہ معلوم تھا کہ لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی والا وہ مرد بزرگ جو

حکیم سینا

ہر روز شام کو بلا ناغہ ہاتھ میں موٹا سا عصا لے کر ایک مقررہ راستے پر سیر کو نکلتا ہے۔ حکیم بو علی سینا ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو ان کے متعلق اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام تو عبدالوہاب یا عبدالصبور تھا مگر اپنے آپ کو خاک پائے بو علی سینا کہتے تھے جو کثرتِ استعمال سے گھس کر صرف سینا رہ گیا تھا۔ کسی طبیب یا طبی درسگاہ سے فن کی تحصیل قطعاً نہیں کی تھی لیکن خود کو فن کا مجتہد سمجھتے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر مطب بالکل نہیں چلتا تھا۔ "معمولی عوارض" کا علاج یہ نہیں کرتے تھے اور "بڑے امراض" کے مریض ان سے علاج نہیں کرواتے۔ عمر بھر شادی نہیں کی، زندگی عسرت میں بسر ہوئی مگر متبنّٰی رکھنے کا شوق اتنا ہے کہ کوئی ڈیڑھ درجن متبنّٰی بدل چکے ہیں۔ آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے چنانچہ ۱۹۲۵ء تک وہ اپنے اس معمول پر پچیس برس کی پابندی کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ ڈگری کی کلاہ پر نیلے رنگ کی جو پگڑی باندھ کر نکلتے ہیں وہ گذشتہ بیس برس سے بندھی پڑی ہے۔ مطب میں مریض غلطی کو آ جائے تو اس کو تضیع اوقات گردانتے ہیں۔ طبیعت میں تلخی ہے، مزاج چڑچڑا ہے۔ عمر بڑی، صحت اچھی۔ البتہ ایک سے ایک دلچسپ ترسینکڑوں باتیں ان سے منسوب اور زبان زدِ عام تھیں۔

حکیم سینا سے میری باضابطہ ملاقات اس وقت ہوئی جب میں زندگی میں

داخل ہونے کے لئے شہر سے باہر جارہا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت عمر کے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے بعد آدمی اچانک کسی دن مر جاتا ہے مگر اس سے زیادہ بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ مطب گھر پر ہی تھا بلکہ جیسا کہ بعد میں دیکھا گھر مطب میں تھا۔ چھوٹی اینٹوں کا چھوٹا سا پرانا مکان تھا جس کی بوسیدہ بیرونی دیواروں کے کئی مختلف شگافوں میں سے دس پندرہ کائی اور سو۔ نھے کے لاڈلے پودے اور بیری اور شہتوت کے معزز درخت بیک وقت پروان چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ مکان اور درختوں کا رشتہ اتنا قایم و محکم تھا کہ اب مکان ان ہی کے سہارے کھڑا تھا۔ غالب نے کسی ایسے ہی مکان کی نسبت کہا ہو گا۔

وحشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

مطب والی کوٹھری گلی میں کھلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بند ہوتی ہی نہ تھی۔ اندر پہنچا تو عالم شہرت کے مطابق مطب بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ حکیم سینا متروک وضع کے ایک پرانے صوفے کی لمبی نشست پر دراز تھے۔ سامنے بے دلی سے چھلا ہوا دیار کا ایک گرانڈیل میز پڑا تھا جس پر تنگ اور چوڑے دہانوں کی گنی چنی سات بوتلیں رکھی تھیں۔ جن میں سے بالخصوص سرمئی رنگ کی ایک بوتل میں سفید

سفید گولیاں مطب کے نمناک دھندلکے میں دھیمی چمک رہی تھیں میز سے لگی ہوئی بے بازو کی دو چوکیاں تھیں، اور دیواروں کے تین چار کشادہ طاقوں میں بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں گرد و غبار میں اس اطمینان کے ساتھ اٹی پڑی تھیں کہ اب ان کو چھیڑنے سے نہ معلوم کتنی صدیوں کی دل آزاری کا احتمال ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے، مختلف طول و عرض کے کھرل اور انواع و اقسام کے ہاون دستے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

میری آہٹ سُن کر حکیم صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ پہلے مجھے کوئی مریض ہی سمجھے۔ نبض کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے:۔

"کیا عارضہ ہے؟"۔ میں نے عرض کیا محض اشتیاقِ ملاقات کھینچ لایا ہے۔ اس پر اپنے خشونت آمیز روکھے پن کو چہرے کی شکنوں سے ظاہر کر کے پہلو سمیٹتے ہوئے بولے:۔

"آپ غالباً اس شہر میں نووارد ہیں۔ میں نے اس قسم کی ملاقاتوں کو کبھی نہیں سراہا خیر اب آپ آہی گئے ہیں تو بیٹھئے۔ لیکن پہلے ذرا میز پر سے میری عینک اٹھا دیجئے۔ مہربانی۔ مگر نہیں۔ رہنے دیجئے"۔ اور پھر خود ہی عینک اٹھاتے ہوئے کہا: "میں نے زندگی بھر اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ عادت کچھ ایسی

راسخ ہو چکی ہے کہ مثلاً اب آپ عینک اٹھا کر دیتے تو بہت ممکن تھا مجھے اس میں سے کچھ بھائی ہی نہ دیتا۔"

"اچھا" میں کچھ تعجب سے بولا۔

"نہیں۔ یہ نئی پود اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم لوگ معاف کرنا یہ چاہتے ہو کہ تمھاری جگہ حوائجِ فطریہ بھی کوئی دوسرا ہی بھگتا آئے۔" پھر عینک کو ناک کی گھوڑی پر سوار کرتے ہوئے: "لیجئے اب بات کیجئے۔ کیا کہوں میری کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ عینک کے بغیر میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں تو آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کون ہو عزیز من؟"

اس تمہید کے بعد اس روز کوئی تین گھنٹے ہماری سیر حاصل ملاقات رہی۔ کہاں تو ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور کہاں یہ کیفیت جو میں نے دیکھی کہ بیچ میں تین چار مرتبہ اٹھنا چاہا تو زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

ان سے اپنی پوری گفتگو قلم بند کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کم از کم تین ہی گھنٹے چاہئیں۔ بہرحال خلاصۂ کلام یہ کہ حکیم صاحب اپنے آپ کو واقعی دیانتداری کے ساتھ وقت کا بو علی سینا سمجھتے تھے۔ بو علی سینا تو خیر ان کے پیکر میں دوبارہ پیدا ہو ہی گئے تھے لیکن ان میں بقراط۔ سقراط۔ ابو نصر اور نہ جانے کن کن دوسرے

حکیم سینا

حکماء اجل کی خوبیاں بھی مجتمع تھیں۔ اس لئے ان کے نزدیک ان کے پایہ کا طبیب آئندہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ دنیا سے وہ شاکی ضرور تھے مگر اس طرح جیسے کوئی باپ نالائق اولاد سے شکایت کرتا ہو۔ انسانوں کو وہ چمگادڑ سمجھتے تھے جو چشمۂ آفتاب کی روشنی سے محروم ہے۔ فن میں اپنی عظمت کا شعور و غرور ان میں اتنا قوی تھا کہ اس پر جان کی بازی لگا بیٹھتے اور حقائق سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہ کہتے تھے کہ بشری کمزوری کے بعض لمحوں میں جب کبھی ان کے ذہن میں طب چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا کرنے کا خیال آیا تو اسی رات حکیم جالینوس بقراط خود حضرت بوعلی سینا اور علم طب کے بعض دوسرے اعالی و اکابر خواب میں آکر کبھی لعنت ملامت کرتے کبھی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت، کہ دیکھو اس دور میں طب کی ایک ہی تو شمع فروزاں رہ گئی ہے۔ حکیم سینا دراصل ان باوضع اطباء میں سے تھے جو فن کو اس کی بقاء کے لئے سینے سے لگائے ہوئے تھے، یہ الگ بات ہے کہ نہ فن زندہ تھا نہ خود آپ۔ پھر بعض نازک مزاج باکمال شعرا کی طرح وہ اپنے آپ کو ایک مقدس قومی امانت سمجھتے تھے ان کو عزت و آسائش کے ساتھ زندہ رکھنا قوم کا فرض تھا اور ان کا اپنا فرض صرف اتنا تھا کہ بس وہ پیدا ہو گئے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب اگر "بوعلی سینا" نہ ہوتے تو "میر تقی میر" ہوتے۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

ہر چند وہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر مستقبل کی طرف سے مایوس ہرگز نہ تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گلی میں بکری کا بچہ بھی گزر سکتا ہے یا نہیں' اس بات کا پختہ یقین تھا کہ قوم ایک دن ہاتھی گھوڑے لے کر ان کے دروازے پر پہنچے گی اور مرنے کے بعد ان کے جنازے پر خلقِ خدا کا ہجوم دیدنی ہوگا۔ انھوں نے بڑے تیقن کے ساتھ مجھ سے کہا تھا "میں اپنی کامیابی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اس وقت تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بس مصر کے ایک مریض کا انتظار ہے۔"

مجھے اعتراف ہے کہ میں حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات میں کافی متاثر ہوا تھا۔ ان کی مضبوط قوتِ ارادی حیرت انگیز تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ملنے والا ترحم اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی شخصیت سے ایک گونہ اثر ضرور قبول کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی تاریخی قبرستان کے کھنڈروں میں ایک خاص عظمت و جبروت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد مختلف وقفوں میں حکیم صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں اور ہوئیں' میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ سال میں بمشکل ایک مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آنے کی فرصت ملتی ہے مگر جب کبھی موقعہ ملتا میں حکیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں میں نے جدید زمانے کے تقاضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پراپیگنڈے کی اہمیت پر زور دینا چاہا تو حکیم صاحب اس طرح بھڑک اٹھے کہ ان کی عمر کا آدمی اس شدت سے بالعموم بھڑک بھی نہیں سکتا۔ غضب ناک ہو کر بولے۔

"کیا کہا پراپیگنڈا ؟"

"جی ہاں"

"جی نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ اب تم یہ بھی کہو گے کہ بازار میں جا کر مجمع بھی لگایا کروں ؟ —— صاحبزادہ صاحب بمشک آنست . . . . . ." اور پھر میز پر سے سفوف کی دو بوتلیں اٹھا کر باہر گلی کی بدرو میں پھینکتے ہوئے کہا۔" یہ لو آج میں نے انسانوں کی بدبختی پر ایک اور مہر ثبت کر دی اگر کسی کتے نے اس نالی میں سے ایک بوند بھی پی لی تو دیکھ لینا کہ وہ جع المفاصل اور عرق النساء کے امراض سے محفوظ و مامون ہو جائے گا، مگر انسانوں کے لئے ان امراض کی شفا اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھ گئی ——" اور حکیم صاحب خود بھی اٹھ کر کرب کی ایک خوف ناک کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

مدت کے بعد پھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو میز کی پانچ بوتلوں میں سے

تین ہی سلامت رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ صرع اور سرطان کا بیڑا بھی غرق کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی امیدیں بڑی تیزی سے ایک ایسی مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں، جس میں انسانوں کے خلاف نفرت اور جذبۂ انتقام کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ انھوں نے بیس برس کی بندھی ہوئی پگڑی کھول کر اس کی جگہ یہ عہد باندھ لیا تھا کہ اب میت ہی دہلیز سے باہر نکلے گی۔ ایک خدا ترس ہمسائے کی معرفت پرانی بوتلیں۔ معجونوں کے مرتبان۔ ہاون دستے اور کھرلیں بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ اپنا پلنگ نو جو تھا مگر مُتبنّٰی والی چارپائی غائب تھی۔ میں نے مزاج پُرسی کی تو کہنے لگے۔

"اور تو کچھ نہیں، ہاں یہ صدمہ ضرور ہے شمس میاں کہ میں زندہ ہوں اور دنیا مر رہی ہے۔ مگر خیر۔ اللہ کے بھیجے ہوئے کتنے سچے رسول بھی بظاہر اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔" اس ملاقات میں یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میرے بیٹھے بیٹھے خدا معلوم کہاں سے اور کیوں خاصی معقول وضع کا ایک مریض لنگڑاتا لنگڑاتا مطب میں آ نکلا ــــ میں خوش ہوا کہ شاید حکیم صاحب کی ساعتِ مراد آ پہنچی مگر وہ تو اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔

"اب آئے ہو وجع المفاصل لے کر جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔"

"لیکن قبلہ" مریض بولا — "میرا مرض ابھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہونے پایا۔"

"جی ہاں" میں نے بھی مداخلت کی۔

"جی نہیں" حکیم صاحب بولے "بندہ نواز اس مرض کی شفا اب انسانوں کے مقدر ہی میں نہیں رہی۔ اب تو لوگوں کو وجع المفاصل سمیت ہی جینا پڑے گا (پھر مجھ سے مخاطب ہو کر) میاں، میرا خیال ہے کہ خطِ نسخ کوفی میں اس مضمون کا طغرا لکھوا کر بازار میں آویزاں کرا دوں؟"

مجھے معلوم تھا کہ حکیم صاحب اس دوا کی بوتل ہی توڑ چکے ہیں مگر اس خیال سے کہ آیا ہوا مریض ہاتھ سے نہ نکلنے پائے میں نے پھر گذارش کی۔

"قبلہ وہ دوا دوبارہ بھی تو بنائی جا سکتی ہے۔"

"جی نہیں۔ وہ نسخہ مسلسل بارہ برس کی ریاضت چاہتا ہے اور وجع المفاصل کا مریض پانچ برس سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔"

یہ سن کر مریض کے پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ پہلے اس نے کانسی کے پیالے میں صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ لنگڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ لیکن ابھی اس کی ایک ہی ٹانگ دہلیز کے پار ہو گی کہ حکیم صاحب بولے،

"شمس میاں مجھے اس شخص کی جوانا مرگی کا بڑا رنج ہو گا مگر کیا کر سکتا ہوں۔

شمس میاں بخدا مجھے اس وقت کے تصور ہی سے ہول آتا ہے جب لوگ پاگلوں کی طرح پکار پکار کر مجھے آوازیں دیں گے مگر حکیم سینا اس دنیا میں نہیں ہوگا۔"

حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دلچسپ ترین ملاقات ثابت ہوئی مطب کی ویرانی پہلے سے سوا تھی۔ میز پر صرف سفید گولیوں والی ایک مرتبانی بوتل رہ گئی تھی۔ پلنگ تک اٹھ چکا تھا مگر چہرے سے وہ گھٹاٹوپ مایوسی چھٹ چکی تھی۔ جتنی بشاشت اس مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے تقریباً لپٹتے ہوئے بولے :۔

"بھئی بڑے اچھے موقع پر آئے! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ کرنے والا ہوں۔ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔" میز والی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بوتل ہے"

"جی نہیں۔ بوتل نہیں ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس میں علم طب کا وہ راز ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ بس آج ہی کھلے گا۔"

"خوب۔ بہت خوب!"

"حیرت سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ ۔ اس نسخے کے اجزا خود بوعلی سینا

رحمۃ اللہ علیہ نے عالمِ رویا میں اس عاجز پر منکشف فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں بقراط و سقراط کی روحیں بند ہیں ——— چاند اور ستارے بند ہیں!"

"یعنی پھر تو واقعی بیحد عجیب چیز ہوئی"

"اور پھر حضرت نے فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی میں فشار الدم کا ایک لاعلاج مریض آئے گا یہ گولیاں اس پر آزمانا"

"تو پھر آپ نے آزمائی؟" میں نے شوق کی بے تابی سے پوچھا۔

"کس پر آزماتا۔ تم پر؟" ——— وہ قدرے جھلا گئے مگر فوراً ہی دھیمے بھی ہو گئے "آج وہ موعود مریض پہنچا ہے جس کی بشارت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اور ہاں۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعد مجھ پر رزق، شہرت عزت کے چالیس دروازے کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مبارک ساعت آگئی ہے۔ مگر شمس میاں میں سوچتا ہوں کہ اگر اس طرح مجھ پر یک بارگی چالیس دروازے کھل گئے تو میں کس کس دروازے سے گذرا کروں گا؟"

اس کے بعد حکیم صاحب نے پورے تحمّل کے ساتھ ساری روداد سنائی کہ فشار الدم کا ایک مایوس العلاج مریض کل اچانک ان کے ہاں آگیا تھا۔ خود مریض کو تو معلوم نہیں کہ اسے کیا مرض ہے مگر حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ اسے فشار الدم

ہی کا عارضہ تھا۔ آج وہ معالجہ کے نئے مطب میں آنے ہی والا تھا کیونکہ ان گولیوں کا تجربہ حکیم صاحب خود اپنے سامنے کرنا چاہتے تھے۔ گولیوں کے سلسلے میں حکیم صاحب نے بتایا کہ بہت مدت ہوئی انھوں نے ایک ناگوری بیل پر دو گولیاں آزما کر دیکھی تھیں جس کا ردِ عمل خاطر خواہ نظر آیا۔ بیل تو خیر ردِ عمل کے صیغے میں صرف اچھلتا کودتا ہی رہا لیکن حکیم صاحب کی رائے میں بیل کو وہ اصل بقراط اور جالینوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس مرحلہ پر میں نے پوچھا کہ آخر بقراط اور جالینوس کے نظر آجانے سے مرض کیونکر دور ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا کہ، ع

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سچ مچ مریض آگیا جو بظاہر ہٹا کٹا گنوار دیہاتی نوجوان تھا۔ بات کی تو معلوم ہوا کہ فشار الدم کا مریض تو ہو یا نہ ہو ذہنی خلفشار کا مریض یقیناً تھا۔ بدحواس، پریشان خیال، پریشان وضع۔ بہر حال حکیم صاحب نے صوفے ہی پر اپنے پاس بٹھا کر کنوئیں کے آبِ تازہ کے ساتھ ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئی ایک گولی اس کے حوالہ کر دی جس کو حلق سے اتارنے کے بعد مریض فوراً بولا۔ "میٹھی ہے۔ دو تین اور دیجئے!" حکیم صاحب سنی ان سنی کر کے نبض تھام

کو ردِ عمل کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض سے پوچھا۔

"کیوں میاں کیا کچھ محسوس ہو رہا ہے؟" ——— جس کے جواب میں مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے گردن کو اس زور سے اپنی چھاتی پر پھینک دیا کہ اگر رگ پٹھے مضبوط نہ ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ گردن ٹوٹ کر باہر جا گرتی حکیم صاحب بولے "اب ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ناگوری بیل پر اسی طرح پہلے غنودگی طاری ہوئی تھی۔ پھر مریض کو خواب آتا ہے۔ پھر بقراط جالینوس۔ چاند۔ ستارے...... " حکیم صاحب ردِ عمل کے مختلف مراحل پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ادھر مریض پر ردِ عمل شروع بھی ہو گیا۔ ردِ عمل کیا تھا اچھلنے کودنے کا ایک مضحکہ انگیز سلسلہ تھا۔ مریض صوفے سے اچھل کر میز پر جا بیٹھتا اور میز سے اچھل کر صوفے پر۔ حکیم صاحب جو جنس کو کسی حالت میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس ردِ عمل میں برابر کے شریک تھے۔ کچھ دیر کی اچھل کود کے بعد پایانِ کار مریض بے ہوش ہو کر میز پر اس طرح جا لیٹا جیسے عامل کے سامنے معمول پڑ رہتا ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے گردو پیش پر یوں نظر ڈالی جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہے۔

"لیجئے اب ردِ عمل شروع ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ـــــ"

"جی نہیں ـــــ ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

(اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے)

"کیوں میاں؟"

"ارے کچھ بولو تو سہی۔"

"ہاں بھئی۔ کہو کوئی چیز نظر آئی؟"

"ہاں ـــــ کچھ ہے تو سہی۔" مریض مری سی آواز میں بولا۔

"کیا ہے؟" حکیم صاحب فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح اچھل کر بولے

"کیا ہے۔ سورج۔ چاند۔ ستارہ۔ انسان ـــــ"

"ابھی تو ایک لمبا سا کان لٹک رہا ہے"

"الٰہی تیرا شکر! ـــــ میاں میرا خیال ہے کہ حکیم بقراط ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کتابوں میں آیا ہے کہ حکیم بقراط کے کان غیر معمولی طویل تھے (مریض سے) ہاں تو کوئی چیز بھی دکھائی دی؟"

"جی ہاں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ بڑے بڑے دانت۔ . . . . . ."

"شاباش! ـــــ یہ سمجھو تمہارا نصف مرض جا چکا ـــــ دیکھا شمس میاں

ان گولیوں کا طلسمی تصرف:

"جی ہاں" میں بولا۔

"جی نہیں" حکیم صاحب جی ہاں کو کم ہی برداشت کرتے تھے "دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو اس شخص کے کف دست پر شمس و قمر اترنے والے ہیں۔ بخدا اس وقت اگر یہ شخص چاہے تو پورے نظامِ شمسی کو ادھر سے اٹھا کر اُدھر پھینک دے (مریض سے مخاطب ہو کر) ــــ ہاں تو بھئی اور کچھ ۔۔۔۔؟"

"دُم؟ ــــ لمبی دُم ــــ" مریض یکبارگی چلّایا ــ اس کی آواز میں خوشی کا جذبہ تھا ــ "دُم؟" ــــ حکیم صاحب دُم بخود ہو گئے ــــ "دُم؟ شاید کوئی دُم دار ستارہ طلوع ہو رہا ہے" ــــ اتنے میں مریض پورے زور سے چلّایا ــــ "وہی ــــ بالکل وہی ــــ ہمارا اپنا کمیدیا گدھا"

"گدھا؟ ــــ لاحول ولا قوۃ ــــ میرا خیال ہے مریض کو ایک اور گولی درکار ہے" ــــ حکیم صاحب میز پر سے بوتل اٹھا ہی رہے تھے کہ ناگاہ دو اجڈ سے دیہاتی مطب میں داخل ہوئے جن میں سے ایک نے آتے ہی زور سے ایک طمانچہ مریض کی کنپٹی پر جما دیا۔

"حرام خور کہیں کا ــ کہاں بھیجا تھا اور کہاں آکر لیٹا ہوا ہے ــــ

"اٹھ بے ـــ اٹھتا ہے یا ـــ" اور مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب اور میں دونوں ہکا بکا تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ ایک نواحی گاؤں کے کمہار تھے۔ کئی روز سے ان کا ایک گدھا کھو گیا ہے۔ "مریض" ان کا ایک نیم فاتر العقل بھتیجا تھا جو تین دن سے گدھے کی "تلاش" میں نکلا ہوا تھا ـــ

یہ سن کر حکیم صاحب نے سفید گولیوں والی وہ آخری بوتل بھی باہر نالی میں پھینک دی۔

○

شیخ صاحب قبلہ

ان کا نام تو شیخ عبدالباسط تھا مگر چھوٹے بڑے سبھی ان کو "شیخ صاحب قبلہ" کہتے تھے۔ ان کے محکمے کا افسرِ اعلیٰ بھی انھیں "قبلہ" ہی کہتا تھا۔ دفتری امور میں ڈانٹ ڈپٹ تک "قبلہ" میں ہو جاتی ——— شہر میں ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اگر صرف "شیخ صاحب قبلہ" لکھ کر لفافہ ڈاک میں ڈال دیا جائے تو ان تک پہنچ جاتا تھا۔ اور "قبلہ" گویا ان کا "تار" کا ایڈریس تھا۔

جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں، قبلہ پنشن کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ متوسط قد۔ گہرا گیہواں رنگ، چھوٹی چھوٹی غلافی آنکھیں، سرخ بھری بھری گنجان

شیخ صاحب قبلہ

ڈاڑھی جس کو وہ عموماً جالی دار فیتے سے باندھ کر رکھتے تھے۔ کیونکہ اگر کھولتے تھے تو وہ نیچے سے اوپر کو جاتی تھی۔ مونچھیں اگرچہ ڈاڑھی کے تناسب ہی سے رکھ چھوڑی تھیں مگر ڈاڑھی بند تھی اور مونچھیں کھلی اس لئے ڈاڑھی سے بڑی معلوم ہوتی تھیں۔ سر پر ہلکی ململ کی بھاری پگڑی۔ برجس کی طرح کا تنگ پاجامہ۔ خاکی ٹاسے کی قمیض جس پر سخت ولایتی کالر اور اس کے اوپر کھلے گریبان کا فراک کوٹ۔ نکٹائی باندھتے تھے اور کالر میں سنہرا بکسوا ضرور لگاتے ــــ در اصل اس حلیئے نے ان کو "قبلہ" بنا دیا تھا ورنہ اندر سے وہ قبلہ وبلہ کچھ بھی نہ تھے۔

اندر کی بات چلی ہے تو اصل میں قبلہ کے اندر بیک وقت کئی مختلف شخصیتوں بلکہ تہذیبوں کا تصادم برپا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی بہت سی خوبیاں بھی بکثرت استعمال اور بے جا استعمال سے خرابیاں بن گئی تھیں ــــ لوگ بظاہر ان کا بہت احترام کرتے تھے مگر غور کرنے پر یہ "احترام" بھی ایک طرح کا لطیفہ معلوم ہوتا ــــ یہی ــــ 'احترام' ان کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ لیکن اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے ان کی زندگی کو سمجھنا ضروری ہے!

شیخ صاحب قبلہ کے قدیم بزرگ کسی زمانے میں کسی چھوٹی موٹی ریاست

کے راجواڑے تھے۔ زمانے نے اپنا ورق الٹا تو راجواڑے سے ویران ہو گئے پھر معمولی پیشہ اہل کاری پر اتر آئے اور گذشتہ کئی پشتوں سے خوانچہ فروشی کا دھندا کر رہے تھے۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ "راؤ صاحب" سے "شیخ صاحب" کب اور کیونکر ہو گئے تاہم بعض علامتوں سے ان کا "راجواڑہ" ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ ایک ظاہری علامت تو بذاتِ خود شیخ صاحب قبلہ کی مونچھ تھی جس کو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور جس کے رنگ و روغن اور تراش خراش پر وہ اتنا خرچ کرتے کہ بقول شخصے اتنے خرچ سے آدمی دودھ دینے والی کوئی چھوٹی سی گائے پال سکتا تھا ——— دوسری ذہنی یعنی اندر کی علامت ان کی "خوانچہ فروشی" تھی۔ راجواڑوں پر جب گردش آتی ہے تو وہ "خوانچہ فروشی" میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے بزرگوں کی تھی۔ پیٹ مجبور کرتا تو خوانچہ لگا کر بیٹھ جاتے، راجواڑی خون موج مارتا تو خوانچہ گاہک کے منہ پر دے مارتے!

شیخ صاحب قبلہ بچپن ہی میں عام بچوں سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے چنانچہ مسجد میں دینیات کا درس ختم کرنے کے بعد جب "خوانچہ" ان کے سامنے رکھ دیا گیا تو آپ نے یہ اُپج پیدا کی کہ ایک جگہ بیٹھ رہنے کے بجائے شہر بہ شہر

گھوم کر مُنہ بیچنے لگے۔ آواز میں رس تھا، کاروبار چمک اُٹھا۔ اسی اثنا میں پارسیوں کی ایک تھیٹر کمپنی سے زیادہ بہتر پیشکش مل گئی اور آپ ایک مدت تک اس تھیٹر کے ساتھ راس کماری سے لے کر پشاور تک گھومتے پھرے۔ لیکن اس دوراندیشی سے کہ تعلیم کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ آدمی ذہین تھے چند ہی سالوں میں پے بہ پے مڈل۔ ادیب فاضل۔ میٹرک اور منشی فاضل وغیرہ کے امتحان پاس کرکے بہتر زندگی کی امنگ میں جب صدر دفتر میں کلرک بھرتی ہوئے تو آپ اچھی خاصی تقریر کر لیتے تھے، بُرے بھلے شعر کہہ لیتے تھے اور گانے میں تو واقعی سماں باندھ دیتے۔ یہ تو خیر انھیں اب تک پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ راجواڑہ ہیں۔ خوانچہ فروش ہیں۔ ایکٹر ہیں کیا ہیں؟ البتہ دفتر میں آتے ہی انھوں نے اس وضع قطع کی داغ بیل ڈال دی جس کا خاکہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آرٹسٹ —— عالم بن رہا ہو!

ملازمت کے ابتدائی دور میں شیخ صاحب قبلہ کی رفتارِ ترقی پر "خود ترقی" بھی انگشت بدنداں رہ گئی۔ آپ اگلی صفوں کو چیرتے پھاڑتے دیکھتے دیکھتے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک جا پہنچے۔ اس کے بعد بھی جب تک انگریزی عملداری رہی اگر تنخواہ نہ بڑھتی تو اعزاز بڑھ جاتا۔ سال میں ایک آدھ خلعت یا انعام ضرور

مل جاتا۔ احترام میں اضافہ کر دیا جاتا۔ حد یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹی کے گزٹ سے پہلے خان صاحبی گزٹ ہو چکی تھی۔ بعض لوگ تو از راہِ مذاق کہا کرتے کہ انگریز جاتے وقت شاید حکومت ہی شیخ صاحب قبلہ کو سونپ جائیں۔

ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ شیخ صاحب قبلہ تقریر اچھی کر لیتے تھے۔ کمال کا خاص پہلو یہ تھا کہ شعر تو شعر آپ "نثر" بھی گا کر ادا کرتے اور ان کی آواز میں بلاشبہ بہت کشش تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ حاکموں کے نوٹس میں شیخ صاحب قبلہ کا یہ کمال کب اور کیونکر آیا مگر جب ایک مرتبہ آگیا تو پھر ایسا فراڈ کے سلسلے میں مغالطے کی بنا پر انگریز کو "دور اندیشی" کے جو دورے پڑتے تھے قبلہ کو اس کا پورا پورا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ قبلہ ملازم تو دفتر میں تھے تنخواہ سپرنٹنڈنٹی کی پاتے تھے مگر عملاً جب دیکھو باہر فیلڈ میں "سرکار انگلشیہ کی برکات" کے جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ جب جھوم کر یہ شعر پڑھتے کہ:

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے دنوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں

تو جلسے کا انگریز صدر سفید سفید مونچھوں والا چیف سیکرٹری یا کمشنر اپنے دل میں دیانت داری سے سمجھنے لگتا کہ واقعی اگر ہم چلے گئے تو اس ملک میں ریلیں کیونکر

چلیں گی؟ ـــــــــ "تار" اگر ایک طرف سے چل بھی پڑا تو دوسری طرف نکلے گا کیسے؛ بہرحال رہیں چلیں یا ٹھہریں شیخ صاحب قبلہ پوری رفتار سے چلے جارہے تھے۔ رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلعی جلسوں میں بھی ان کو بلانے لگے اور دوسری جنگِ عالمگیر میں جب لڑائی کا آہنگ تیز ہوا تو قبلہ کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اگر انگریز ہوتے تو ان کے لئے شاید ہوائی جہاز کا انتظام کرنا پڑتا۔ شیخ صاحب قبلہ کا ستارۂ اقبال اس وقت پورے عروج پر تھا:

لیکن جب قوم کا ستارہ چمکا تو قبلہ کا ستارہ ڈوب گیا۔ آزادی نے پوری قوم پر ترقی کے دروازے کھولے تو ان پر بند ہو گئے۔ وجہ ظاہر تھی ـــــــ اب نہ مغالطے کا امکان تھا نہ جلسے کا سامان۔ مغالطے آزادی نے اور جلسے لیڈروں نے صاف کر دئے تھے۔ پھر قبلہ کی شخصیت جو ایک خاص نہج پر تعمیر پا چکی تھی اور بالخصوص ان کا احترام اپنی جگہ الگ ایک دیوار بن گیا۔ حالت یہ تھی کہ محکمے کا کوئی شعبہ ان کو اپنے ہاں لینے پر رضامند نہ ہوتا۔ افسروں کو ڈر تھا کہ قبلہ کو کام وام کی تو عادت نہیں الٹے ہمیں ان کے احترام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ملازموں کے بے شمار ریلے پیچھے سے آکر آگے نکل چکے تھے۔ بعض بڑے سینئر افسران کے آگے بچوں کی طرح جونیئر تھے۔ بہت سوں نے تو ہوش کی آنکھیں ان جلسوں میں

کھولی تھیں جہاں قبلہ چیف سیکرٹری کے دائیں یا بائیں پہلو میں تشریف رکھتے تھے کیفیت اب یہ تھی کہ قبلہ جس دفتر میں ہوتے یوں معلوم ہوتا جیسے اپنے پوتوں یا نواسوں میں بیٹھے ہیں۔ سرکاری تقریبوں میں یا تو کہاں وہ برات کے دولھا ہوتے یا ایسے جہاں سے قبلہ کی قطار شروع ہوتی وہاں تقریب کا شامیانہ ہی ختم ہو جاتا۔

قبلہ گذشتہ پندرہ بیس برس سے سپرڈنٹی پر بیٹھے تھے۔ یوں لگتا جیسے قبلہ سپرڈنٹی پر یا سپرڈنٹی ان پر گویا جم گئی ہے۔ دلچسپ بلکہ دردناک بات یہ تھی کہ قبلہ کی شخصیت پرانے دور میں جتنی اہم ہو چکی تھی سپرڈنٹی کا عہدہ نئے دور میں اپنی اہمیت اتنی ہی کھو چکا تھا۔ اگر کوئی کہتا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ آپ کے سرپرست ہیں آپ کسی سے کچھ کہتے سنتے کیوں نہیں؟ تو استغنا کے عالم میں اکڑوں ہو کر بیٹھ جاتے، دونوں شانوں کو اٹھا کر کانوں تک لے جاتے ڈاڑھی کا فتیلہ کھول دیتے اور گویا ایک قسم کی ملائرا ہوئی بن کر فرماتے —— برخودار اپنے بارے میں کسی سے کیا کہوں —— کون ہے جو مجھے نہیں جانتا؟ ——

بات ٹھیک بھی تھی۔ سب لوگ ان کو جانتے تھے۔ بلکہ خرابی ہی یہ تھی کہ سب لوگ ان کو بہت زیادہ جانتے تھے۔ بعض سرپرست یوں متذبذب تھے کہ قبلہ کی جائز

امداد بھی ناجائز سمجھی جائے گی۔ بعض یہ سوچتے کہ قبلہ کی ہاءو کرنے والے ہزاروں دوسرے موجود ہیں۔ اکثر لوگ قبلہ کو پیرے سے وفتر کی چیز ہی نہ سمجھتے۔ دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ قبلہ کے اکثر سرپرست جو "رموزِ سرپرستی" سے واقف تھے۔ ریٹائر ہو کر قبلہ کی طرح اب خود "پبلک" ہو چکے تھے۔ جو نئے سرپرست تھے ان کو یہی خبر نہ تھی کہ روشِ بندہ پروری کیا ہے؟

عام زندگی میں بھی ان کے "احترام" کا پایہ گر چکا تھا۔ یوں بڑے لوگ تقریبوں دعوتوں میں ان کو مدعو کرتے تھے مگر محض گانے کے لئے۔ سوال یہ تھا کہ کھانے کے بعد مہمان کیا کریں؟ شراب بند، قوال مہنگے، جادو کے پروفیسر کمیاب اور قبلہ گھر کا مال۔ شروع شروع میں تو قبلہ اس خیال سے قدرے مطمئن رہے کہ چلو تھوڑا بہت احترام تو ہے۔ میں بڑے سے بڑے افسر سے فون پر بات کر لیتا ہوں، جس سے جس وقت ملنا چاہوں چق اٹھا کر اندر چلا جاتا ہوں۔ لوگ میری چھوٹی موٹی سفارشیں بھی مان لیتے ہیں۔ موٹر میں پاس سے گذرتے ہیں تو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہیں۔ ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟ لیکن عمر اور احترام کے مختلف مرحلوں سے گذرنے کے بعد اب وہ اس صورتِ حال پر کچھ خوش نہ تھے۔ خوش ہوتے بھی تو کیسے۔ لوگوں نے ان کو پیشہ ور گانے والا سمجھ لیا تھا۔

حالانکہ اگر وہ گانے کو پیشہ بنا لیتے تو پیسے بھی زیادہ ملتے اور سوسائٹی شاید احترام بھی زیادہ کرتی۔ سرکاری دفتر کا سپرنٹنڈنٹ گا رہا ہو تو وہ گانے والا رہتا ہے نہ سپرنٹنڈنٹ قبلہ جب ان محفلوں میں اقبالؔ یا حالیؔ کی غزل گاتے تو اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین پرس میں سے شیشہ نکال کر لپ اسٹک درست کرنے لگتیں اور قبلہ دل ہی دل میں لہولہان ہو جاتے مگر انکار کا بھی یارا نہ تھا کہ بڑے بڑے لوگوں سے ہزاروں چھوٹی چھوٹی تمنائیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ بچارے زمین کا گز بنے مارے مارے پھرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ جلتی دوپہر میں گھر سے نکلے۔ بائیسکل پنچر ہو گئی۔ پیدل مارا مار کرتے میزبان کی کوٹھی پہنچے تو لنچ ختم ہو چکا تھا مگر میزبان نے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا کہ لیجئے قبلہ آ گئے۔ اور قبلہ کے سر کا پسینہ چوکر ایڑی سے بہہ رہا ہے مگر گا رہے ہیں :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

میں قبلہ کے خاص نیازمندوں میں سے تھا اور ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا۔ عام لوگوں کے سامنے تو وہ احترام کے اس پردے کو تانے رکھتے۔ لیکن میرے سامنے کلیجہ نکال کر ہاتھ پر رکھ دیتے۔ وہ اپنے اس مصرف پر بہت دکھ محسوس کرتے تھے۔ میں جب بھی حاضر ہوا انہیں چار دعوت نامے ضرور ان کے

سامنے موجود ہو سے جن کو ترتیب وار میری طرف سرکاتے ہوئے فرماتے۔

"۱۳ ر جولائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیخ صاحب قبلہ مرغیاں پالو کے جلسے" میں گا رہے ہیں"

"۱۶ ر جولائی والٹر لاک کے انگریز منیجر کی دعوت پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"۲۰ ر جولائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعوتِ ولیمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر ایک زہر خندہ کے ساتھ میری طرف دیکھتے اور مجذوبوں کی طرح زور سے نعرہ لگاتے ——— ہائے صبورا وائے شکورا! وصبورا اور شکورا ان کے بیٹے تھے!

ایک روز حاضر ہوا تو بیزاری کا عجیب عالم طاری تھا ——— وہی طائرِ لاہوتی" بنے بیٹھے تھے لیکن برہمی کا انداز کہہ رہا تھا کہ آج ——— یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!

مجھے دیکھتے ہی بڑے جذبے سے فرمایا ——— "جاؤ میاں کسی حجام کو پکڑ لاؤ"

"اس وقت حجام؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ——— میں سوچ رہا ہوں یہ ڈاڑھی مونچھ منڈوا ہی ڈالوں؟"

"خیریت تو ہے قبلہ؟" ——— اور انھوں نے ایک لمبا چوڑا سنہرا دعوت نامہ میری طرف کھسکا دیا۔ لکھا تھا۔

"..........عزیزم کی رسمِ ختنہ پر.........بتاریخ.....

بوقت.........غریب خانہ پر.........."

نیچے کارڈ کے حاشیے میں "غریب خانے" کے کسی کلرک نے اپنے ہاتھ سے یہ نوٹ لکھ رکھا تھا ——— "قبلہ اگر آج یہ غزل تیار ہو سکے تو سبحان اللہ

وہ شوخ آج جس گھر میں مہمان ہوگا

قیامت کا اس گھر میں سامان ہوگا

یہ خود سرکار کی فرمائش ہے۔"

قبلہ نے میری طرف دیکھا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قبلہ بھی سکتے ہی میں رہیں گے لیکن اس شام جب "ختنہ والی کوٹھی" کے سامنے سے میں گذرا تو نغمہ گونج رہا تھا۔

وہ شوخ آج جس گھر میں مہمان ہوگا

شیخ صاحب قبلہ خوانچہ لگائے بیٹھے تھے!

کیمپ کے شب و روز

۱۰ر جُون :

کیمپ میں پہلا دن ——— !

دوپہر کو دفتر سے خیمے میں آیا تو اندر دو گلہریاں ناچ رہی تھیں۔ ایک ٹب پر جو کیمپ کارٹ کے ساتھ ہی لگا رکھا تھا پھدک رہی تھی، دوسری میز پر شیو کے آئینے میں منہ دیکھ رہی تھی۔ میری آہٹ پر چیں چیں کرتیں پردے کے نیچے سے جو پیچھے غسل خانے کی چھولداری میں کھلتا ہے، بلکہ بند ہوتا ہی نہیں، باہر دوڑ گئیں۔ اتنے میں کیمپ کا پرانا خدمت گار کاکا چاچا پانی کی بالٹی اٹھائے آگیا۔ میں نے کچھ

شکایت کچھ سوزنش کے لہجے میں کہا:

"کاکا ـــــــ خیمے میں گلہریاں ناچ رہی تھیں"

معلوم ہوا کہ یہ تو ہماری اپنی گلہریاں ہیں، یعنی خیمے کے پیچھے جال کے درخت کی کھوہ میں رہتی ہیں اور جب سے کیمپ کھلا ہے روزانہ ٹھیک اس وقت خیمے میں آکر پانی پیتی ہیں۔ مجھ سے پہلے جو لیشنزان افسر اس خیمے میں رہتا تھا وہ تو ان گلہریوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ گلہریاں جب تک خیمے کے اندر ہوتیں وہ خود باہر دھوپ میں کھڑا رہتا۔ وہ تو ان کے لئے امریکہ سے کوئی تخ دان منگوانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اتنے میں خود ہی امریکہ چلا گیا!

ٹب کے بارے میں کاکا سے پوچھا کہ یہ غسل خانے کی چیز یہاں کمرے میں کیوں پڑی ہے۔ تو اطلاع ملی کہ چونکہ یہاں سخت گرمی پڑتی ہے لہٰذا صاحب لوگ عموماً ٹب ہی میں بیٹھتے ہیں۔ بعض اصحاب تو کھانا تک ٹب میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ مجھے یہ بات سُن کر بے ساختہ ہنسی آگئی!

یہ کیمپ ایک انجینئرنگ فرم کا کیمپ ہے جو ایک قریبی پہاڑی کا جگر کاٹ کر اس کا باطن ٹٹول رہی ہے۔ اکثریت غیر ملکی ماہرین کی ہے۔ ہم تین چار مقامی آدمی صرف رابطے ترجمانی وغیرہ کا فرض ادا کرتے ہیں۔

۱۲ ؍ جون :

کاکا چاچا واقعی ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔ لوگ باگ دوپہر کے بعد سگریٹ سگار سلگا کر ٹب میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آج میں بھی ٹب میں بیٹھا تامس ہارڈی کا ایک ناول پڑھتا رہا۔

خیمے کے بالکل سامنے تربوزوں کا ایک کھیت ہے۔ عصر کے وقت کچھ دیر کھیت میں ٹہلتا رہا۔ کھیت تربوزوں سے اٹا پڑا ہے۔ بعض تربوز تو اتنے بڑے ہیں کہ تربوزوں کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ ٹہلنے سے اکتایا تو انھیں میں سے ایک لیڈر کی پشت پر بیٹھ کر دوسرے تربوزوں کو دیکھتا رہا۔ دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ تربوز کو دیکھ کر تربوز کس طرح رنگ پکڑتا ہے۔ مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہاں تربوز کو دیکھ کر تربوز موٹے ضرور ہوتے ہیں!

۱۶ ؍ جون :

پچھلے دو تین دن ڈائری نہ لکھ سکا۔ دراصل پرسوں شام کو آندھی آئی تو میرے گیس کی چمنی ٹوٹ گئی اور کیمپ میں ـــــ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ـــــ کاکا چاچا کہیں سے ایک مری ہوئی لالٹین اٹھا لایا تھا مگر اس کی روشنی میں خود لالٹین بھی بمشکل سے سجھائی دیتی تھی۔ بارے کہ آج قصبے سے دوسری چمنی آ گئی۔

یہ کیمپ جتنا پھیلا ہوا ہے اتنا بڑا نہیں ہے۔ ایک طرف افسروں کے خیمے ہیں کچھ دور ماتحتوں کی بارکیں۔ پھر کچھ اور دور مزدوروں کے جھونپڑے — بارکیں بنی ہوئی نہیں زمین سے اُگی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

لنچ پر آج تربوز کے سُرخ سُرخ قتلے بھی تھے۔ میں بھاگا بھاگا کھیت میں پہنچا کہ کہیں میرا بڑا تربوز تو شہید نہیں ہو گیا۔ الحمدللہ کہ لیڈر سلامت تھا!

۱۷ جون:

آج سماوتی کے ساتھ بڑی لمبی چوڑی سرگشت رہی۔ اور آج پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کہ یہ کیمپ دراصل ایک کوہ قامت سلسلہ کے دامن میں واقع ہے لیکن جغرافیہ کچھ اس نوع کا ہے کہ بعض اوقات خود سلسلہ کوہ کیمپ کے دامن میں واقع نظر آتا ہے۔

ایک بازو پہ جھاڑ جھنکار کا وسیع بیابان ہے جس کے بعد ایک شاداب وادی کھلتی ہے جو اس قدر تنگ ہے کہ گویا کھلتے ہی بند ہو جاتی ہے کیونکہ یکبارگی ہی پھر پہاڑیوں کا ایک دوسرا سلسلہ طلوع ہو جاتا ہے جو نہ معلوم کہاں جا کر غروب ہوتا ہے۔

سامنے کے بازو پر ایک نامی گرامی دریا بہتا ہے جس کو ہم سن تو سکتے ہیں

دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ کیونکہ اس تک پہنچنے کے لئے پہلے جس اونچی پہاڑی پر چڑھنا پڑتا ہے وہ آدمی کو کسی قیمت پر دوسری طرف اترنے نہیں دیتی۔ اور چوٹی پر سے دریا اس طرح نظر آتا ہے جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں مارا ہو گیا۔

سنتے ہیں کہ اس دریا سے بجلی نکالی جائے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر سے نکالی جائے گی!

دریا اور کیمپ کے درمیان ایک ننھی سی ترائی ہے جس کو اکائی کہنا زیادہ درست ہو گا۔ وسط میں بدھوں کا ایک چھوٹا سا اسٹوپا ہے جو خدا معلوم اس جگہ کب اور کیوں بنایا گیا تھا اس کے بعد جھاڑیوں کا ایک سلسلہ اور پھر تربوزوں کا وہی کھیت جس کا حاشیہ کیمپ کے حاشیے سے آن ملا ہے۔ اگلے روز جو آندھی چلی تھی اس میں بہت سے تربوز ٹوٹ کر میرے خیمے میں آ گئے تھے۔ کسی روز ہوا نے رُخ بدلا تو انشاء اللہ میرا خیمہ تربوزوں کے کھیت میں ہو گا۔ اللہ اکبر فطرت سے یہ قرب بھی کس قدر سنسنی خیز ہے کہ آدمی فطرت کو روٹی کی طرح توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

۱۸ر جون؛

ہمارا میس خاصا پُر فضا مقام ہے۔ چھوٹی سی لائبریری، چھوٹا سا لان، چھوٹا سا بار سبھی چیزیں موجود ہیں۔ مگر مجھے وہاں جاتے ہوئے ایک گونہ وحشت ہوتی

یوں لگتا ہے کہ یہ لوگ پچھلے دو سو سال سے یہیں بیٹھے وہی باتیں دوہرا رہے ہیں۔ فلسفے کا خمیر شاید تجرد، تنہائی اور ویرانی ہی سے اٹھتا ہے!

۱۹ر جون:

اس خطے میں جو ایک سخت جان اور شاندار درخت پائے جاتے ہیں یہ وہی مشہور و معروف درخت ہے جو کسی قسم کی آب و ہوا کے بغیر خود بخود اُگنے اور فی سبیل اللہ پھولنے پھلنے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ چنانچہ وسطی ایشیا سے اگتا ہوا یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ شیر شاہ سوری نے اپنی شاہراہِ اعظم کے گرد اگرد اسی کے پیڑ لگوائے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیڑ پہلے لگ گئے ہوں اور سڑک بعد میں داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔

خال خال کوئی جانا پہچانا درخت بھی دکھائی دے جاتا ہے مگر اس ماحول میں بے چارہ کچھ مہاجر سا معلوم ہوتا ہے جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ شیشم کا ایک ایسا ہی تنہا پیڑ تربوزوں کے کھیت کے دوسرے کنارے کھڑا ہے۔ ڈنر سے آیا تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دیر تک بڑے تربوز پر بیٹھا شیشم کے اس پیڑ کو تکتا رہا۔ ایک عجیب ناقابلِ فہم درد تھا جو فضا میں مرتعش تھا۔ یہ میرا درد تھا، چاندنی کا درد یا شیشم کا درد ——— کون کہہ سکتا ہے؟

۲۴ جون :

۲۱ جون کو آندھی کا زبردست طوفان آیا — اور — جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی۔ تین چار خیمے زن سے صاف اڑ کر تربوزوں کے کھیت میں جا رہے۔ جو خیمے اپنی جگہ پر قائم رہے ان کا سامان نکل بھاگا۔ لوگ باگ اب تک اپنے موزے، رومال، جانگیے، ٹائیاں، تولئے وغیرہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ میرا دیوانِ حافظ آج تک نہیں ملا۔ شاید بہت اونچا اڑ گیا، شاید دریا میں جا گرا۔ میری پھندنے والی سُرخ رُومی ٹوپی جو مڈل کے امتحان کے لئے والدِ مرحوم نے خرید کر دی تھی اور اب ایک مدت سے صرف نماز پڑھنے کے کام آتی تھی سامنے والے جال کی سب سے اونچی پھننگ میں جا کر اٹک گئی ہے۔ ٹہنیاں ہلتی ہیں تو پھندنا اس شان سے لہراتا ہے گویا گنگنا رہا ہو — چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا !

سوچتا ہوں کہ ٹوپی کو اتار لوں یا وہیں رہنے دوں۔ ایک خیال آتا ہے کہ وہیں رہنے دوں۔ آخر بُڈھی تو اس ویرانے میں اپنا اٹھو یا چھوڑ گئے ہیں۔ درویش کا تحفہ ٹوپی۔ پھر سوچتا ہوں کہ نہیں اتار ہی لوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت ہمارے پورے برّاعظم میں یہ آخری پھندنے والی رومی ٹوپی ہو؟ — خیر اگلے اتوار تک تو

اس طرح چلنے دو!

۲۶ر جون:

آج ملک میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی برسی منائی جا رہی ہوگی۔ یہاں چراغ حسن حسرت تو در کنار مولانا حسرت موہانی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں۔ جو تین چار ہم خود ہیں وہ بھی ہم خود نہیں ہیں۔ ہمارے نام تک ہمارے اپنے نہیں صبور صاحب سمارٹی میں بجا دیے ——— ٹونی لے ——— اور زوکی ——— اس نے اپنے لئے کوئی پیچیدہ سا فرانسیسی نام تجویز کر رکھا ہے۔ شیلے بائرن سب کو یاد میر و مومن کا نام تک نہیں سنا۔ کس سے کہتا کہ کون مر گیا ہے۔ ناچار اپنے کنجِ تنہائی میں بیٹھا خود ہی در و دیوار کو آوازیں دیتا رہا کہ

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں

بعض اوقات غم میں بھی اچانک کوئی دلچسپی کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً آج جس وقت میں گہرے درد و کرب کے ساتھ حسرت مرحوم کا یہ مصرع بار بار گنگنا رہا تھا کہ ——— "آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں" تو دیکھتا کیا ہوں کہ بوڑھا کاکا چاچا ہاتھ میں پالش کا برش پکڑے ایک کونے میں کھڑا ہے اور ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں کاکا چاچا کیا بات ہے

تو بڑی عماؤ خانہ آواز میں بولا ــــــــ "صاحب مجھے اپنی صنوبر جان یاد آرہی ہے!"

۲۷ر جون:

آج دن بھر کوئی عجب قسم کی دیوانی فاختہ جال کے جھنڈ میں گوکتی رہی ــــ فاختائیں تو یہاں اکثر گوکتی رہتی ہیں مگر اس ظالم کے گلے میں تو گویا کسی نے ہارمونیم فٹ کر دیا تھا۔

پرسوں سے ایک نئے انجینئر ایک مختصر سے معلوماتی و مطالعاتی دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ آپ انجینئر کم اور تاریخ دان زیادہ ہیں۔ جیسے بجز دان انمکدان وغیرہ۔ مطالعہ کی غایت تو یہ تھی کہ اس دریا سے بجلی کیونکر پیدا کی جائے مگر آپ تحقیقات فرما رہے ہیں اس امر کی کہ اگر ہندوستان کے قدیم شمال مغربی حملہ آوروں کو اس دریا کے پورے طاس کا علم ہو جاتا تو تاریخ کا رُخ کیا ہوتا؟ حیران ہوں کہ پیسے کمپنی والوں سے وصول کر رہے ہیں اور کام سکندرِ اعظم کا کر رہے ہیں!

میری رومی ٹوپی ہنوز درخت پر آویزاں ہے!

۲۸ر جون:

دونوں گلہریاں بدستور اپنے وقت پر آرہی ہیں۔ اب میری آہٹ سے

بھاگتی نہیں، بوٹوں میں چھُپ جاتی ہیں۔ خانہ بدوش قبائلوں کے ڈیرے سے ایک بھورا کُتا بھی سہ پہر کی چائے پر اکثر آنکلتا ہے اور ایک آدھ ٹوسٹ لے جاتا ہے مسخرا کچھ اس متوقع صورت سے دُم ہلاتا ہے اور کمبخت کی آنکھوں میں چاپلوسی کی کچھ ایسی چمک تیرتی ہے کہ اس کو دیکھ کر میں بعض اوقات اپنے اندر جھانکنے لگ جاتا ہوں اور کبھی کبھی یُوں محسوس ہوتا ہے گویا میں اپنے افسر کے سامنے کھڑا دُم ہلا رہا ہوں۔

کھیت سے بڑا تربُوز آج غائب ہے۔ افسوس! —— زمین کھا گئی نوجوان کیسے کیسے!

۲۹ جُون:

آج ایک مشہور شاعر کا خط مِلا

"اشعار کی بھرمار پہ احوال نا دارد"

بمشکل تمام اشعار کی تفسیر و تعبیر سے سمجھ میں آیا کہ آپ آج کل بیمار ہیں اور جتنے بیمار ہیں اتنی ہی زیادہ شراب پیتے ہیں۔ اشارہ و کنایوں سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اب مجھے ان کے خطوط کا فائل کھول دینا چاہیئے!

یکم جولائی:

میری عادت ہے کہ بہانے بہانے سے کام نہ کرنے کی تقریبات پیدا کرتا رہتا ہوں۔ مہینے کا پہلا دن میری ایسی ہی تقریبات میں سے ہے کہ جن کے احترام میں، میں تمام دن کوئی کام نہیں کرتا۔ آج عصر تک ٹب میں بیٹھا رہا۔ پھر ذرا ٹہلنے کے ارادے سے باہر نکلا تو ناگاہ وہ تیر سینے میں لگا کہ ہائے ہائے! میری ٹوپی درخت سے غائب تھی۔ بہت تلاش کیا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ قیاس ہے کوئی عقاب اُدھر ہی اُوپر لے اُڑا یا زمین پر سے کوئی گیدڑ لے بھاگا۔ مایوس ملول خیمے میں آ کر پڑ رہا۔ ٹوپی بار بار خیالات میں گھومتی رہی ——— اس ٹوپی پر والدِ مرحوم دستِ شفقت پھیرا کرتے تھے ——— اس ٹوپی میں ڈال کر میں بھُنے ہوئے چنے کھایا کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گاؤں کے مڈل سکول سے لے کر پنجاب یونیورسٹی کے ایوان عالی شان تک یہ ٹوپی میرے سر پر رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری "عشق" اسی ٹوپی سے آغاز کیا۔ ۔ ۔ ۔ یہ ٹوپی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہ معلوم کب تک ان خوابوں میں کھویا رہتا کہ کاکا نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا "صاحب آج تو میس میں بال نائٹ ہے" اور میں جلدی سے ڈنر کے لئے تیار ہو کر میز سے ایک مغربی ٹوپی اُٹھا کر سیٹی بجاتا میس کو چل دیا

لیکن دل میں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نہیں کوئی دوسرا شخص میری جگہ چلا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی ٹولی کے ساتھ اڑ کر کہیں دور جا چکا تھا!

اس وقت شب کے ۱۰ بجے کا عمل ہے۔ میں خیمے میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا ہوں۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں مگر اس خوف سے سو نہیں رہا کہ میں سو گیا تو ٹولی جاگ پڑے گی۔

۲ر جولائی:

انکل گریگوری ہمارے میس کی دلچسپ ترین شخصیت ہیں۔ آپ دونوں عالمی جنگوں میں داد شجاعت دے چکے ہیں۔ ہر جنگ میں بحصہ مساوی تین تین مرتبہ زخمی اور دو دو مرتبہ قید ہوئے۔ جسم پر اتنے زخم ہیں کہ گویا اپنے زمانے کے "رانا سانگا"۔ نہایت واہیات قسم کی مونچھیں پال رکھی ہیں جن کو ناک کے بالوں سے مسلسل کمک پہنچاتے رہتے ہیں۔ عمر بہت خاصی ہو چکی ہے لیکن زندگی کے محاذ سے ریٹائر ہونے پر ہنوز آمادہ نہیں۔ ایک عرصہ سے انجینئر فرمون کی ملازمت میں اپنے سفید طوطے کے ساتھ جس کو آپ فیلڈ مارشل رومیل کے نام سے پکارتے ہیں ملک ملک گھوم رہے ہیں۔ ساری عمر کیمپوں میں گذر گئی ہے۔ یہ ان کی زندگی کا پچیسواں کیمپ جا رہا ہے جس کی سلور جوبلی کا پروگرام

آج کل ہم لوگ بنا رہے ہیں۔

انکل جس کیمپ میں بھی رہے عموماً اور خصوصاً بھی میس کے انچارج رہے حد یہ ہے کہ جرمنوں کی قید میں بھی لنگر کا انصرام انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کام کا سلیقہ بھی انھیں پر ختم تھا۔ ضرورت ہو تو یہ ہمالیہ کی چوٹی پر کلب کھول دیں اور ایسا کلب کہ انسان دیکھ کر آئینہ حیرت یا حیرت آئینہ (جو بھی درست مناسب یا شایانِ شان ہو) بن کر رہ جائے۔ کلب کھانے سے نہیں سامان سے چمکتا ہے اور زیبائش و آرائش کا بہت سا سامان ان کا ذاتی ہے جس کو انکل گشتی تھیٹر کے سین سینری کی طرح ہر جگہ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ انکل کمپنی والوں سے تنخواہ نہیں اپنے سامان کا کرایہ ہی لے رہے ہیں!

پرانے کینوس کی کچھ تصویریں ہیں، جن میں زرہ و مغفر کے گھوڑے اور خود و مغفر میں ڈوبے بکتر بند شہسوار، تیر کمان ڈھال تلوار سے لڑ رہے ہیں۔ انکل کے دعوے کے مطابق ان میں سے کسی تصویر کی عمر چار سو برس سے کم نہیں۔ یہ بھی ان کا انکسار ہے ورنہ بعض تصویروں میں تو اب سرے سے کوئی نقش نظر ہی نہیں آتا۔ کچھ مبہم سے خطوط رہ گئے ہیں جن کو آپ اپنی پسند و

کوشش کے مطابق کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً میں ایک تصویر کو ہاتھی کا بچہ سمجھ رہا تھا انکل نے بتایا کہ یہ تو مصر کا سب سے بڑا اہرام ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا اہرام اور بس اتنا سا۔ بولے کہ مصور نے جب یہ شاہکار بنایا تھا اہرام اس وقت ابھی اتنا ہی تعمیر ہوا تھا۔

کھال میں بھرے ہوئے تین چار شیر دھرے ہیں سو وہ بھی اتنے قدیم کہ صدیوں سے شاید ان کی نسل ہی منقطع ہو چکی ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے میں میس میں بیٹھا لائف میگزین میں شیر کے شکار پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ معاً جو ایک اپنے شیر کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کی آنکھ (اس شیر کی ایک ہی آنکھ ہے) ایسی غیر معمولی روشنی نظر آئی۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہی میری گلہری شیر کے جبڑے میں بیٹھی تھی اور اس کی ایک آنکھ شیر کی آنکھ میں سے چمک رہی تھی!

چاندی کے بھاری بھاری کپ خنجر چھری کانٹے اور گلاس ہیں جن میں سے گلاس ہم لوگ استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ سامان دراصل سولھویں صدی کی کسی برٹش کیولری رجمنٹ کا اثاثہ ہے جو نہ معلوم کب کیوں کس طرح انکل کے تصرف میں آ گیا۔ ہر گلاس پر کوئی نہ کوئی نام کندہ ہے۔ میں جب پانی پیتا ہوں تو میرے لئے یہ احساس بڑا عجیب سا ہوتا ہے کہ نواب میں کرنل فرگوسن کے گلاس میں پانی

پی رہا ہوں جو ۱۸۱۲ء میں ٹانگانیکا میں پیدا ہوئے اور اب بریگیڈیئر جنرل گوڈگرانٹ کے گلاس میں ہیں جو اسی سال مدراس میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوئے انکل نے ماحول میں برطانیہ کی تاریخ کو اس شدت سے بھر دیا ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ ہم تاریخ کے اوپر چل رہے ہیں، تاریخ سونگھ رہے ہیں۔ تاریخ کھا رہے ہیں۔ میں تو کبھی کوئی پردہ سرکاتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں کہ کہیں پیچھے سے جیمز ڈائل ہی نہ نکل آئیں!

تحائف میں سے اکثر چیزیں مرنے والوں کی یادگار ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرنے والوں کی اکثریت گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوئی۔ موجودہ گلاسوں میں سے دس گلاس مرنے والوں کی نشانیاں ہیں۔ ان میں صرف ایک طبعی موت مرا، ایک مچھلی کا شکار کھیلتے سمندر میں ڈوب گیا باقی آٹھوں گھوڑے سے گر کر مرے۔ انگریزوں کی تاریخ پر گھوڑے کا کتنا گہرا اثر ہے؟ خود انکل کہتے ہیں کہ گھوڑا نہ ہوتا تو انگریزوں کی سلطنت کبھی نہ ہوتی۔ اور یہ بات بھی کہ اگر گھوڑا نہ ہوتا تو بہت سے انگریز جو مر چکے ہیں شاید آج زندہ ہوتے!

بات سے بات کی طرح گھوڑے سے بھی گھوڑا نکلتا ہے۔ انگریزوں کے گھوڑے سے میرا ذہن قدرتی طور پر مسلمانوں کے گھوڑے کی طرف مڑ جاتا

ہے۔ دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ بھی گھوڑے ہی کی تاریخ ہے۔ جب تک گھوڑا ان کی ران تلے رہا، فاتح و کشور کشا رہے۔ گھوڑے کی باگ چھوٹی تو سلطنت کی باگ بھی چھوٹ گئی۔ سلطنت کچھ دیر سلامت بھی رہی تو یہ عالم تھا کہ

"نہ ہاتھ باگ پر ہیں نہ پا ہیں رکاب میں"

اور ہاں یاد آیا کہ اقبال نے بھی تو کہا ہے۔

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

۳ر جولائی:

ڈنر کے بعد بہت دیر تک لان میں بیٹھا جنوب مشرقی پہاڑیوں میں چاند کو ڈوبتے ابھرتے دیکھتا رہا ——— عجیب رومان انگیز منظر تھا ——— جی میں آیا کہ ابھی اپنے رومان نگار دوست ابوالفطرت کو تار دے کر بلوا بھیجوں مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ میں یہاں کنول کے پھول، انگور کی بیلیں، اناناس کے شگوفے اور زعفران کے کھیت کہاں سے لاؤں گا اور لمبے سنہرے سمور والی اور زرد نارنجی آنکھوں والی بلی کہاں سے پیدا کروں گا جس کے بغیر ان کی کوئی کہانی آگے ہی نہیں چلتی؟

○

عجب آزاد مرد تھا ....

مسٹر لینگگان مقامی ریلوے کالونی میں تنہا اینگلو انڈین رہ گیا تھا۔ باقی تمام اینگلو انڈین نوکری سے رفتہ رفتہ سبک دوش ہو کر ولایت یا آسٹریلیا جا چکے تھے۔ جو سمندر پار کے سفید ملکوں تک نہیں پہنچ سکے وہ کراچی میں جا آباد ہوئے کہ وہاں کی ساحلی فضا اور بین الاقوامی ماحول میں ان کی معاشرتی و تمدنی تسکین کا کچھ سامان موجود تھا۔ مگر مسٹر لینگگان انجن ڈرائیور ابھی تک اس کالونی میں پڑا تھا جو اینگلو انڈین نقطۂ نگاہ سے اب بالکل ویران، افسردہ اور مردہ ہو چکی تھی۔

وہ یوں بھی تنہا تھا۔ اس کی بیوی کو مرے ایک سال ہو چکا تھا جس کی

تاریخِ وفات اس نے اپنے پلنگ کے سامنے دیوار کی سفیدی پر پنسل سے لکھ رکھی تھی۔ اس کے نیچے دوسری سطر میں وہ تمام خرچ لکھا ہوا تھا جو مسز لینگان کی تجہیز و تکفین پر اٹھا تھا۔ مسٹر لینگان کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ لڑکیاں فینی اور مینی جنگ کے دوران میں فوجی گوروں کے ساتھ شادی کر کے افریقہ چلی گئی تھیں، اور جب سے گئی تھیں انھوں نے بوڑھے لینگان کو خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔ لڑکا رابرٹ ماں کی موت کے بعد گھر کا تمام فرنیچر فروخت کر کے پچھلے چھ ماہ سے لاپتہ تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ مسز ولیم نام ایک بیوہ میم ٹائپسٹ کے عشق میں گرفتار ہو کر کراچی جا پہنچا تھا۔ یہ مسز ولیم پچھلے سال تک اسی کالونی میں مسٹر لینگان کے بازو والی کوٹھی میں رہتی تھی۔

مسٹر لینگان سے میری ملاقات مکان کے سلسلہ میں ہوئی اور مجھے اعتراف ہے، کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے بے حد دلچسپ، پُرلطف اور غیر معمولی کردار معلوم ہوا۔ مجھے مکان کی جستجو تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ریلوے کالونی میں قسمت آزمائی کرو۔ ممکن ہے وہاں کوئی شخص مکان کا کچھ حصہ آگے کرائے پر دے ڈالے۔ کیونکہ ریلوے نے چھوٹی چھوٹی تنخواہ کے ملازموں کو بھی بڑے بڑے کوارٹر اور کوٹھیاں دے رکھی ہیں اور اس کالونی میں لوگ اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں۔

دونوں طرف سے ملازموں کی ابتدائی گفتگو کے بعد ایک روز تفصیلات طے کرنے کے لئے میں خود مسٹر لینگان کے ہاں پہنچ گیا، وہ اگرچہ انجن ڈرائیور ہی تھا، مگر سفید گریڈ میں تھا، کہ ریلوے میں اب تک یہ سفید اور کالے گریڈ چلے آتے ہیں ایک اچھا خاصا بنگلہ اُسے ملا ہُوا تھا۔ چار مربع کشادہ کمرے، ہر کمرے میں چھت کا پنکھا، تین غسل خانے، ہر غسل خانے میں پانی کی ٹونٹی، سامنے نہایت خوبصورت برآمدہ، عقب میں علیحدہ باورچی خانہ اور سرونٹ کوارٹرز، تین طرف پھیلا ہُوا باغیچہ جس میں مسلسل بے توجہی کے باعث گلاب کے پودے کھڑے کھڑے سُوکھ گئے تھے۔ اور گنجان خودرو ڈھنگ کی جھاڑیوں نے جنگل کا منظر پیدا کر رکھا تھا۔ مسٹر لینگان اپنے تمام اثاثے سمیت ایک کمرے اور ایک غسل خانے میں سمٹا ہُوا تھا۔ باقی تین کمرے خالی تھے، جو میرے لئے بہت تھے۔

گنگو جو بیک وقت کوٹھی کا جمعدار اور صاحب بہادر کا خانساماں تھا، مجھے اس کی کوٹھڑی میں لے گیا۔ کمرے کے وسط میں ایک پلنگ بچھا تھا اور مسٹر ملینگان آنکھیں بند کئے بستر پر دراز تھا۔ مگر مسٹر ملینگان کا ہے کو تھا، ہڈیوں کا ایک بھورا اور خاکی ڈھانچہ تھا کہ بستر پر پڑا تھا۔

پلنگ کی پٹی سے لگا ہُوا آئینے کے بغیر ایک پرانا سنگار میز تھا جس پر شراب

کی بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں، کچھ اوندھی کچھ سیدھی، بکھری پڑی تھیں۔ کمرے میں ایک ہی الماری تھی جس کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ یہ الماری بھی شراب کی خالی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ بڑا کتا بروسس، غسل خانے میں ڈیرہ ڈالے تھا، اور دوسری یعنی مسز بروسس اپنے تین چار ننھے پتوں کے ساتھ لینگان کی میلی کچیلی رضائی میں گھسی ہوئی تھی۔ الماری کے اوپر، سرہانے کی طرف حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی دو بڑی تصویریں خاصے قیمتی چوکھٹوں میں آویزاں تھیں، چوکھٹوں کی آب و تاب مدت سے مکھیوں کی اُگلی ہوئی گندگی میں دب کر ختم ہو چکی تھی۔

مسٹر لینگان سو رہا تھا۔ گنگو نے جگانے کی کوشش کی تو بڑی مشکل سے بیدار ہوا معلوم ہوا کہ حضرت سو نہیں رہے تھے بلکہ شراب کی غنودگی میں دھت پڑے تھے ـــــ اُٹھا، تو میری طرف دیکھنے سے پیشتر یا اگر اُس نے مجھے کسی طرح دیکھ بھی لیا تھا، تو مجھ سے کلام کئے بغیر لیٹے لیٹے مسٹر لینگان نے میز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رَم کی بوتل میں سے نصف کے برابر شیشے کا ایک گلاس بھر کے رسمی طور پر میری طرف دیکھا اور ازراہِ اخلاق و مہمان نوازی گلاس مجھے پیش کیا، مگر میری معذرت پر خود غٹاغٹ چڑھا گیا۔

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ مدتوں کا بیمار تھا۔ عمر پچاس یا پچاس سے کچھ ہی

اوپر ہو گی۔ مگر وہ ستر برس کا ایسا فرتوت نظر آتا تھا۔ جس کے جسم و روح کو مسلسل بیماریوں نے چاٹ لیا ہو۔ میری رسمی مزاج پرسی پر مسٹر ڈلینگان نے اپنی دھنسی ہوئی نیم باز و بےنور آنکھوں کو بھینچ لیا۔ اور زندگی کے فلسفے پر گفتگو چھیڑ دی۔

"بھائی۔ زندگی جیسے آتی جائے، قبول کیتے جاؤ۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ـــــ زندگی......"

"تو ان کمروں کے لئے مجھے کتنا کرایہ ادا کرنا ہو گا؟" میں نے گفتگو کا رخ اصل معاملے کی طرف پھیرنے کی کوشش کی۔

"کرایہ؟" اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے کمال بے نیازی کے ساتھ کہا۔ "کرایہ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پیسے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آسانی سے رم کی کچھ بوتلیں مہیا کر دیا کریں تو مہربانی ہو گی۔ مگر اس میں بھی کوئی جبر یا پابندی نہیں۔ اور اگر ان بوتلوں میں آپ بھی شریک ہوا کریں تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔"

اور اس نے رم کا ایک نصف گلاس بھر کر خالی کر دیا۔

"مسٹر ڈلنگان" میں نے جواب دیا۔ "ان بوتلوں میں شرکت کی سعادت تو شاید میں حاصل نہ کر سکوں۔ البتہ آپ کو ہر ماہ رم کی تین بوتلیں پیش ضرور کر دیا کروں گا۔" میں یہ کہہ کر اجازت لے کر آ گیا مگر دل میں دیر تک سوچتا رہا کہ آج کتنے

عجیب و غریب آدمی سے ملاقات ہوئی ہے۔

ایک ہی مکان میں رہنے سہنے سے پھر تو مسٹر ملیگان سے اکثر ملاقات رہنے لگی اور اس عجیب و غریب کردار کی زندگی کے بعض حیرت انگیز گوشے سامنے آنے لگے۔

اُسے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، جس میں سے وہ میری تین بوتلوں کے علاوہ ہر کوئی اڑھائی تین سو روپے کا رم پیتا تھا۔ لال جی کے ہاں اس کا کھاتہ کھلا تھا۔ گنگو ہر روز وہاں سے ایک بوتل لے آتا۔ پچاس روپے ہر مہینے وہ اپنے فائرمین کو دیا کرتا کیونکہ اصل میں انجن وہی چلاتا تھا۔ مسٹر ملیگان کا تو خود اس کے اپنے قول کے مطابق یہ حال تھا کہ رم کے نشے میں سگنل وغیرہ دیکھنا تو خیر بڑی باریکی کی بات تھی، اُسے بعض اوقات سرے سے اسٹیشن کی عمارت بھی نظر نہ آتی۔ پچاس روپے گنگو کو جس میں اس کی تنخواہ اور باورچی خانے کا خرچ سبھی کچھ شامل تھا اور حق یہ ہے کہ یہ بہت کافی رقم تھی کیونکہ اس کی روزانہ زندگی کے پروگرام میں کھانے کا کوئی خانہ ہی نہ تھا۔ وہ صرف پیتا تھا۔ گنگو نے بہت مجبور کیا تو کسی وقت تھوڑا سا دلیہ زہر مار کر لیا۔ بقیہ روپوں میں کتوں کا راتب چلتا تھا، کتوں سے اسے عشق تھا

البتہ یہ ضرور فضول خرچی تھی کہ پچھلے ایک برس میں ڈیزی نے جتنے بچے دیے تھے وہ سب بچوں کے توں موجود تھے۔ کتوں کی تعداد دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہوتا کہ مسٹر لینگان کتوں کے کسی جزیرے میں آباد ہے۔ وہ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں۔ وہ پائینتی میں دبکے ہوئے ہیں۔ وہ بغل میں ہمک رہے ہیں۔ وہ بستر کی چادر کھینچ کر کونے میں لے گئے ہیں —— اور ڈیزی تو خیر مستقلاً بستر ہی میں سکونت رکھتی تھی۔

مسٹر لینگان کا دستور العمل یہ تھا کہ یا تو ڈیوٹی پر ہے، اور ڈیوٹی کا بھی یہ عالم کہ عبدالدین فائرمین اسے تھام کر شیڈ میں لے گیا، اور اسی طرح تھامے تھامے واپس چھوڑ گیا —— اور جب گھر پر ہے تو رم پی کر انٹاغفیل پڑا ہے۔ میں مسلسل آٹھ مہینے اس کی زندگی کو قریب سے دیکھتا رہا۔ اس نے اس مدت میں ایک مرتبہ بھی غسل نہیں کیا۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ شیو ضرور بنوا تا تھا مگر وہ بھی کہیں باہر انجن ہی میں بنواتا تھا —— انجن ڈرائیوروں کے پاس ایک "ٹول بکس" ہوتا ہے جس میں انجن کے ضروری اوزار رکھے ہوتے ہیں، مسٹر لینگان نے اس ضروری بکس کو بھی رم کی بوتلوں سے بھر رکھا تھا۔

کبھی کبھی میں مسٹر لینگان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ "تم آپ کہتے ہیں، میں شراب چھوڑ دوں۔ مگر کیسے چھوڑ دوں؟ جس طرح آپ، میرا مطلب

ہے جہلم اور راولپنڈی کے لوگ خاندانی سپاہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں خاندانی شرابی ہوں۔ شراب پیتے ہوئے یہ میری تیسری پشت ہے۔ شراب میرے خون میں رچی ہوئی ہے۔ میرا دادا اور میرا باپ شراب ہی سے مرے تھے۔ میں بھی بڑی تیزی سے اپنے انجام کی طرف دوڑا جا رہا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں، اور میرے لئے اس سے بہتر ہے بھی کیا کہ میں بعجلت تمام اپنے آپ کو ختم کر لوں۔" ——— اور وہ رم کے دو تین گلاس اوپر تلے خالی کر دیتا۔

پہلی ملاقات کے وقت بھی ہر چند وہ مشتِ استخواں سے زیادہ کچھ نہ تھا مگر رفتہ رفتہ اس کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی۔ اب ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا۔ کھانسی بھی لاحق ہو گئی۔ اور بلغم میں خون کے سرخ حاشیے بھی نظر آنے لگے۔ مگر وہ زندگی کا ہر غم غرقِ رم کئے جا رہا تھا۔

میں اس کی تنہائی اور بیماری کے خیال سے اکثر اس کے پاس جا بیٹھتا، اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا زیادہ خراب تھی۔ میں نے پھر اسے ترکِ شراب کا مشورہ دیا۔ اور اس نے پھر وہی اپنا سکہ بند جواب دہرا دیا۔ بلکہ آج اس نے اپنے جواب پر کچھ اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"خواہشات کا احترام کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ آپ آئے میں نے رم پیش کی۔ آپ نے انکار کیا۔ میں نے مزید اصرار نہیں کیا۔"

"یہ کتے بستر تو بستر، میرے صندوق میں سے کپڑے تک کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ میں ان کا دل بھی آزردہ نہیں کرتا۔"

میز پر رکھے ہوئے شکردان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شکر پھانکنے کو جی چاہتا ہے۔ میں شکردان کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شکردان کو میری یہ حرکت ناگوار گزر رہی ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو: شکر مت پھانکو مجھے تکلیف ہوگی۔"—— اور میں فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔"—— اور پھر رم کا ایک گلاس بھرتے ہوئے۔

"ہاں البتہ صرف یہ ایک ایسی چیز ہے جو میری طرف دیکھ کر، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہے۔ خوش ہوتی ہے۔ میرا استقبال کرتی ہے۔"

—— اور رم کا وہ گلاس اس نے یکبارگی اپنے حلق میں انڈیل دیا۔

ایک روز ازراہِ مشورہ میں نے مسٹر لینگان سے کہا "میری قطعی رائے ہے کہ آپ پھر شادی کرلیں۔ آپ کی موجودہ زندگی نہایت بے مقصد اور اندوہناک ہے۔ آپ کو ایک ساتھی کی سخت ضرورت ہے۔"

"شادی؟ ——— شادی میں نہیں کر سکتا" مسٹر ڈلینگان اٹھ کر بیٹھ گیا "میں اس موضوع پر اکثر سوچ چکا ہوں، میں خود چاہتا ہوں کہ کوئی میری دیکھ بھال کرے مگر شادی کا سودا بہت مہنگا معلوم ہوتا ہے، شادی کے نام سے مجھے اپنی مرحومہ بیوی یاد آجاتی ہے جو ایک ماہ بیمار اور ایک ماہ تندرست رہتی تھی، ہر مہینے ایک سو روپے اس کی بیماری پر اٹھتے تھے۔ بچوں کا جھنجھٹ الگ۔ اب میں مزے سے رم پیتا ہوں، خیر، اس وقت تو چلو مجھے عورت کے جسم کی ضرورت تھی، اب تو ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ پھر میں کس لئے گھر میں عورت لاکر شراب کو گھر سے نکال دوں، میرے نزدیک تو جنوبی افریقہ کی تیز رم کی ایک بوتل بلکہ اس بوتل کا ایک بجرعہ، ایک عورت سے کہیں بہتر ہے۔"

——— اور وہ کالی کالی بدبودار افریقی رم کا ایک گلاس غٹاک سے پی گیا۔

ایک دن مسٹر ڈلینگان بہت زیادہ پی گیا۔ گنگو اور میں اس کے پاس بیٹھے تھے اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو گنگو نے کمال تحقیق و تاسف کے ساتھ پوچھا۔

"صاحب! اس طرح کب تک جینا ہوگا؟"

"مگر جینا چاہتا ہی کون ہے بڈھے" وہ گنگو کو اسی نام سے پکارا کرتا تھا "میں

تو دراصل مرنا چاہتا ہوں، البتہ خودکشی نہیں کر سکتا کہ اس سے قدرت کی دل آزاری ہوتی ہے ——"

اتنے میں غسل خانے میں لیٹے ہوئے بروس کو نہ جانے کس بات پر غصہ آگیا کہ زور سے عف عف شروع کر دی۔ ٹویزی کے وہ چار ہوشمند پلّے جو گھبرا کر بھاگے تو مسٹر لینیگان کے لحاف میں آ گھسے اور استر کے شگافوں میں سے ڈھیر سی روئی گھسیٹ کر نالی میں لے گئے۔ ایک دوسرا پلّا دھم سے ٹھیک مسٹر لینگان کے منہ پر آگرا۔ اور اپنی تر بتر زبان اس کے منہ میں ڈال کر گھمانے لگا۔

—— اور مسٹر لینیگان نے اس تمام ماجرے میں اُف تک نہ کی۔ واقعی وہ کسی کی دل آزاری نہ کرنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ میرے سامنے گنگو نے جو انگریزوں کی خدمت کرتے کرتے انگریزوں سے زیادہ ولایت کی زندگی کا قائل و معترف تھا، ولایت چلے جانے کی تجویز پیش کی، مگر مسٹر لینیگان نے اس مشورے کو بھی بڑی سختی سے رد کر دیا۔ کہنے لگا۔

"ولایت کا میرے سامنے نام ہی مت لیا کرو، لندن تو لندن، میں تو کراچی بھی جانے کو تیار نہیں ہوں۔ (رم کا گلاس پی کر) مجھے ان لوگوں پر سخت حیرت ہوتی جو لندن دوڑے جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا کی ساری آبادی ایک

نقطے پر سمٹ کر آ جائے تا آنکہ یہ صورت پیدا ہو جائے کہ نہ کسی کو کھانے کے لئے روٹی ملے، نہ سر چھپانے کو چھت، ——— (رم کا ایک اور نصف گلاس خالی کرتے ہوئے) بڈھے! میری عشرت کی معراج پی کر سو رہنا ہے۔ لندن میں مجھے یہ عشرت کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ وہاں مجھے رم کون لا کر دے گا؟ وہاں تو مجھے اپنی چائے اور توس بھی خود تیار کرنے پڑیں گے اور میں اس طرح اپنی عشرت کو غارت نہیں کر سکتا۔ مجھے اگر چائے توس ہی تیار کرنے ہیں تو میں شادی ہی نہ کر لوں؟ مگر میں تو اپنی سرخوشی کو کسی قیمت پر اور کسی طرح بھی آلودہ نہیں کرنا چاہتا" ———

اور اس نے رم کا نصف بھرا ہوا ایک گلاس اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام لیا۔

غالباً فروری کا پہلا ہفتہ تھا۔ رات کا سماں، غضب کا جاڑا، آسمان پر گہرے نسرا بادل چھائے ہوئے تھے۔ شمال کی طرف پہاڑ کی چوٹیوں پر کوندے کی لکیریں اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی تھیں، ریلوے کالونی پر ایک مہیب تہ در تہ تاریکی مسلط تھی ہم لوگ سر شام ہی بستروں میں دبک گئے تھے۔ مسٹر ٹلیگان کے کمرے سے اُس کے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں کبھی کبھی آ جاتی تھیں۔ یا وقفوں کے بعد بوڑھے بروس کی غضب ناک عف عف فضا میں گونج جاتی تھی۔

کوئی دو بجے کا عمل ہو گا۔ ناگاہ لنگو نے میرے دروازے پر دستک دی اور

مجھے پکارا میں ہڑ بڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ گنگو؟
"صاحب کو کچھ ہو گیا ہے، ذرا دیکھئے تو"

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہم جلدی سے کمرے میں پہنچے۔ لینگان بے سُدھ پڑا تھا۔ میں نے دل اور نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ مگر مجھے زندگی کی حرکت و حرارت کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ لیکن دل لینگان کی موت کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اتنا بے ضرر، مرنجان مرنج آدمی اور مر جائے، ناممکن —— ناممکن —— اتنے میں گنگو —— ساتھ کے بنگلوں سے رحیم بخش گارڈ، غلام رسول اے۔ ٹی۔ او۔ اور رحمت اللہ کیرج انسپکٹر کو بھی جگا لایا۔ اطلاع ملنے پر تھوڑی دیر میں ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر ہاشمی بھی ربڑ کی نالی سنبھالے آ پہنچے۔ مگر مسٹر لینگان، ڈاکٹروں، دواؤں اور انسانی سعی و چارہ گری کی دسترس سے بہت دُور جا چکا تھا۔ بہت دُور!

اُس کے بوڑھے، زرد، نحیف چہرے پر ایک عجیب سکون، طمینان کا سایہ چمک رہا تھا۔ بیرو اُس پلنگ کے ارد گرد دُم ہلاتا پھر رہا تھا۔ بے تاب و پریشان ڈیزی ہم میں سے ایک ایک کے پاؤں چاٹ رہی تھی۔ اُداس اور خاموش بلے ایک کونے میں جا دبکے تھے۔ اور میز پر افریقی رَم سے نصف بھرا ہوا شیشے کا ایک گلاس چمک رہا تھا ——

ہم لوگ

ہمارے گروپ میں زیادہ تر ادیب، شعرا، فن کار اور دانش ور شامل تھے جو دن بھر ایک باقاعدہ بے قاعدگی کے ساتھ کسبِ معاش کا دھندا کرتے، رات کو بڑے خلوص کے ساتھ شہر کے مختلف قہوہ خانوں میں گپ لڑاتے اور اس کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں ادب، آرٹ، دانش وغیرہ کی تخلیق کرتے۔ بعض فن کار فن کو زندگی سے اتنا مقدم سمجھتے تھے کہ زندگی خود ان کی گرفت سے نکل گئی تھی۔ چند بڑے افسر بھی گروپ میں شامل تھے جو اگر بڑے افسر نہ ہوتے تو بہت چھوٹے آدمی ہوتے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ تھے جو بظاہر زندگی کے ایسے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے

جن کا ادب اور آرٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر وہ ادب اور آرٹ کے سرپرست سمجھے جاتے تھے، پھر بعض متفرق قسم کے افراد، جو نہ معلوم کیوں، کب اور کس طرح مجتمع ہو کر گروپ میں در آئے تھے مگر اب اس کا جزو بن چکے تھے۔

آزادی سے پہلے ہم لوگ عموماً مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھتے تھے آزادی کے بعد جب پرانی قدریں بار نے لگیں تو شہر کے بڑے کلب کے دروازے بھی ہم پر کھل گئے۔ جب یہ دروازے کھلے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے ہم پر جنت کے دروازے کھل گئے ہوں۔ ہم میں سے بعض کو آزادیٔ وطن کی تمنا ہی محض اس لئے تھی کہ بڑے کلب میں داخل ہونے کی آزادی مل سکے گی مگر جب وہاں داخل ہوئے تو بہت جلد باہر نکلنے کی آرزو نے بے چین کر دیا۔ کلب کے خلاف ہمارے گروپ میں ہزاروں اعتراضات پیدا ہو گئے۔ ہزاروں تو خیر میں نے یونہی اجمالاً کہہ دیا۔ تفصیل میں دیکھئے تو اختلافات چار پانچ سے زیادہ نہ تھے۔ مگر ہاں غم و غصہ ہزار ہا اختلافات سے بھی زیادہ تھا۔ اس پر گروپ کا قومی مزاج، کچھ اس قسم کا کہ ہم کسی ایک اختلاف پر بھی کلب کو توڑ کر پھر اسی دیوار پر جا بیٹھتے جہاں سے کچھ پہلے کلب کے جگمگاتے ہوئے چھری کانٹوں کو دیکھا کرتے تھے۔

ہمارے نقطۂ نگاہ سے کلب میں بعض بہت بڑی قباحتیں اصلاح طلب

تھیں۔ بنیادی قباحت کلب کا معیار تھا جو اتنا اونچا نکل گیا تھا کہ زندگی کلب سے باہر چلی گئی تھی۔ کم از کم قومی سانچے میں ڈھلی ہوئی جس بھرپور مخلصانہ زندگی کو ہم سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ وہاں اس کے تصور کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فرنگی تو فرنگی، خاص اپنے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک یورپ سے واپس نہیں آئے تھے۔ جو یورپ نہیں جا سکے تھے وہ پاور جہاز بیٹھے تھے۔ یہ لوگ عموماً موسم اور کلچر پر بحث کرتے تھے جو ہوتے ہوتے اس قدر آسان ہو چکی تھی کہ صاحب لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد بیرا لوگ بھی موسم اور کلچر پر بحث کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ایران کے قالین و سمور سے واقف تھے مگر ایران کے حافظ و سعدی سے بے خبر۔ وہ ہم میں سے ضرور تھے مگر ہماری طرح کے ہرگز نہیں تھے۔

کلب کے مشروبات و ماکولات میں سے بیشتر چیزیں عقیدہ و توفیق کی مجبوریوں کے باعث ہماری دلچسپی سے خارج تھیں۔ ایک سے ایک بڑھیا اور مفرح دیسی شربت بازار میں موجود تھا مگر بوتلوں کی صورت ایسی واہیات تھی کہ ان کے بار پانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ —————— درجنوں قسم کے کھانے وہاں ضرور مل جاتے تھے اور ان میں سے بعض یقیناً مزیدار بھی تھے مگر ان لاطینی کھانوں کے ساتھ جب تک پیرس کے "الجزائر کلب" کی چہل پہل پر تبصرہ نہ کیا جائے یوں محسوس

ہوتا گویا ہم کھانے کو نہیں۔ کھانا ہمیں کھا رہا ہے۔ ادھر اپنا یہ عالم کہ لے دے کر ترنم کے ساتھ۔ اشعار پڑھ سکتے تھے سو اس میں یہ بجوگ آ پڑا تھا کہ چھری سے کاٹ لینے کے بعد نوالے کا ریزہ کانٹے کی نوک پر اتنی مدت تک ٹک ہی نہ سکتا کہ آدمی اطمینان سے شعر سُنا سکے یا جھوم سکے۔

شربت کے تذکرے سے یہ نہ سمجھئے کہ ہیئت و صورت کی قید بوتلوں تک ہی محدود تھی۔ ممبروں پر لازم تھا کہ وہ اچھی وضع قطع کے ساتھ کلب میں آئیں۔ انسان اندر چاہے جیسا کچھ بھی ہو، لباس عمدہ در عمدہ ہو۔ بوتل شربت سے زیادہ اہم تھی۔ آزادی کے بعد اگرچہ کلب کے قوانین شیروانی پاجامے پر بھی اتر آئے تھے مگر ہم پر یہ پابندی بھی سخت گراں تھی۔ گروپ کے اصحاب الرائے کے نزدیک تفریح کو اگر لباس میں جکڑ دیا جائے تو پھر اچک اٹھتا ہے، روح مر جاتی ہے۔ اختلاف فروعی نہیں اصولی تھا۔ جہاں عام لوگ لباس کو زینت سمجھتے تھے وہاں ہمارے "مردانِ حُر" اس کو زحمت و مشقت گردانتے تھے ؎

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

انتظامیہ کو ایک مرتبہ خیال آیا شاید یہ لوگ گھر سے آئینہ دیکھ کر نہیں نکلتے اس پر کلب کے برآمدے میں دو تین قدِ آدم آئینے نصب کر دئیے گئے مگر فن کار

ممبر جب آئینے میں اپنی ہئیت دیکھ کر اس پر اُلٹا اظہارِ اطمینان کرنے لگے تو دوسرے ممبر مارے حیرت کے آئینہ بن گئے۔

مغربی رقص و موسیقی کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ جب تک ہم کلب کی بیرونی دیواروں پرسے دیکھتے، سنتے تھے، یہی رقص، یہی موسیقی ایک آسمانی نعمت معلوم ہوتی تھی۔ قریب پہنچے تو اس رقص و موسیقی سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ رقص میں تو خیر پھر بھی ایک کیفیت تھی، لیکن موسیقی نہایت وحشت آفریں ثابت ہوئی۔ رقص کے کسی نقطہ پر جب فردِ محظوظ ہونے لگتے تو گروپ کے بعض ممبر، جو انتظامِ حکومت میں تو کوئی آواز نہیں رکھتے تھے مگر اپنی جگہ نظامِ حکومت کا پورا فلسفہ منضبط کئے بیٹھے تھے، اس سرور کو فسق و فجور کی تعریف میں لے آتے۔

ایک مرتبہ ہم نے کلب میں اردو ڈرامہ کھیلنے کی تجویز پیش کی تو دوسرے ممبروں نے تجویز کے ساتھ ہمیں بھی حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بہت زور دینے پر اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ اول تو پروگرام دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہو اور ثانیاً پروڈکشن کی نگرانی پورٹی مس شعیب پشینگ کے سپرد ہوگی تاکہ کلب کی شہرت پر حرف نہ آنے پائے۔ اپنے کلچر کی خدمت کے خیال سے ہم نے یہ شرط بھی قبول کر لی مگر کلب کے ہموار، ناہموار، متضاد و متصادم رجحانات کے طفیل تجویز کا لقبِ شخصے نہی

حشر ہوا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

ہوا یہ کہ پہلے تو سرے سے کوئی ایسا ڈرامہ ہی ملنے میں نہ آیا جو ڈرامہ بھی رہے اور دو گھنٹے کیا معنی چار گھنٹے میں بھی ختم ہو سکے۔ ناچار گروپ کے ایک تمثیل نگار نے جو مقامی آغا حشر کے لقب سے مشہور تھے، جہانگیر اور نورجہاں کے تاریخی معاشقے کے تار و پود پھیلا کر خود ہی ایک ڈرامہ تصنیف کر ڈالا یہ "شانِ جہانگیر عرف کابلی معشوقہ"

مصنف آخر ڈرامہ نگار ہی تھا مؤرخ نہ تھا اس لئے ڈرامہ میں بعض تاریخی غلطیاں رہ گئی تھیں تاہم بحیثیت مجموعی ڈرامہ ایسا برا بھی نہ تھا۔ البتہ پرجوش مصنف نے مغلوں کی عظمت و شوکت اور رنگینی پر جو دریا دلی صرف کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات آٹھ قلعوں، پندرہ بیس جھونپڑیوں اور تیس چالیس پری جمال کنیزوں کے بغیر جہانگیر ٹہلنے پر بھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مزید برآں اکبر کو تو خیر وہاں ہونا ہی چاہئے تھا مگر تمہید کے طور پر بابر اور ہمایوں، بیرم خاں اور کوئی بیر زا کو کا بھی اسٹیج پر چلے آئے تھے۔ جہانگیر کے دربار میں استاد عرفی اور طالب آملی کا مشاعرہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ؎

ہم لوگ

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

شیپ شٹینک بڑی ذہین خاتون تھیں۔ مدتوں لندن کے ایک ممتاز تھیٹر میں کام کر چکی تھیں۔ ہم نے اپنے ڈرامے کا پس منظر، کاسٹ اور مطالبات ان کے سامنے رکھے تو بھونچکا سی رہ گئیں۔ دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے بولیں۔ یہ ڈرامہ تو شہنشاہِ جہانگیر کی ذاتی سرپرستی ہی میں کھیلا جا سکتا ہے۔ کاسٹ کی وضع قطع متعین کرنے کے لئے ہم نے مغلوں کی جو تصویریں پرانے کیلنڈروں میں سے کاٹ کر جمع کی تھیں ان سے بیچاری شیپ شٹینک کو یہی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں اکبر کون ہے اور جہانگیر کون؟ کاسٹ کے لئے ملے جلے اداکار اکٹھے کئے گئے تو ہر خاتون نور جہاں بننے پر مصر تھی۔ ریہرسل شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ کانونٹ سکولوں میں پڑھی ہوئی یہ بیبیاں ڈرامے کے پُرشکوہ مکالمے ادا کرنے تو درکنار ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتیں۔ ماحصل یہ کہ ایک دن ہم جس نور جہاں کو گھیر گھار کر لاتے مکالموں کے خوف سے وہ دوسرے دن بھاگ جاتی۔ جہانگیر موجود، نور جہاں غائب۔
ایک نسبتاً قدامت پسند کنبے کی قدرے روشن خیال لڑکی درمیان میں ایسی بھی مل گئی تھی جو اردو بے تکلف پڑھ بول سکتی تھی مگر اسے جہانگیر کا یوں والہانہ انداز میں لپک لپک کر نور جہاں کی طرف پیش قدمی کرنا سخت ناگوار تھا۔ وہ صرف کسی ایسے مرنجان

مرنج جہانگیر کو برداشت کر سکتی تھی جو دربار لگانے کے بجائے بازار میں خوانچہ لگاتا ہو۔

خارجی موانع کے علاوہ رفتہ رفتہ داخلی نقادوں نے بھی سر اٹھانا شروع کیا۔ ایک ریسرچ سکالر نے اعتراض کیا کہ یہ جو پورے چھ فٹ کا جہانگیر ٹہلنے کو چھوڑ دیا گیا ہے، فی انچ لغو چیز ہے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق جہانگیر کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ ہمارے لئے یہ مشورہ بوجوہ ناقابلِ عمل تھا، پانچ فٹ کا جہانگیر دیکھ کر پوری قوم کے احساسات مجروح ہوتے تھے۔ پانچ فٹ کے جہانگیر کی عظمت بحال رکھنے کے لئے پونے پانچ پانچ فٹ کے مان سنگھ اور شائستہ خاں اور خافی خاں کہاں سے پیدا کرتے؟

پورے میک اپ کے ساتھ ڈریس ریہرسل ہو رہا تھا کہ اتفاقاً اس روز کرنل فردوسی تشریف لے آئے۔ کرنل صاحب کا نام تو کچھ اور تھا مگر ایران میں مدت تک رہنے نیز فارسی ادبیات سے گہرے شغف کے باعث دوستوں کے حلقے میں وہ کرنل فردوسی کے نام سے مشہور تھے۔ ریہرسل میں جب عرفی اور طالب آملی عصا ٹیکتے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو کرنل صاحب نے پوچھا،

"دوہری کمر والے یہ سفید ریش بزرگوار کون ہیں؟"

"ملک الشعراء اُستاد عرفی"

"ہائیں!" کرنل صاحب بیتاب ہو کر اچھل پڑے "یہ عرفی ہے؟ کیسا عرفی؟ ارے کونسا عرفی ہے یہ؟"

"جی، وہی طالب آملی، الاعرفی" مصنف نے جواب دیا "وہی۔ آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را۔ والا عرفی"

"غالباً کرنل صاحب کو عرفی کی لمبی رومی کلاہ پسند نہیں آئی"

"فکر کی بات نہیں" مس شیپ شٹینک خرابی کا اندازہ کرتے ہوئے بولیں "ہم اس کا داڑھی اور لمبا کر دے گا"

"نہیں سمجھے!" کرنل فردوسی بڑے کرب کے ساتھ بولے "ظالمو! یہ کیسا لبِ گور قسم کا عرفی گھڑ لائے ہو۔ ارے میاں! عرفی تو ایک روایت کے مطابق اٹھائیس اور دوسری کے مطابق انتالیس برس کی عمر میں مر بھی چکا تھا؟"

"مگر حضور سنئے تو" ——— مصنف اپنی صفائی پیش کرنے لگا "غمِ جاناں و غمِ دوراں میں سے کسی چیز نے بیس ہی برس میں عرفی کی کمر دوہری اور بال سفید کر دئے تھے"

"جی ہاں" ایک شاعر صاحب بولے "خیال رہے کہ عرفی شاعر تھا فیچ

کا حوالہ! میجر کمال خاں نہ تھا کہ بہتر برس کی عمر میں بھی تیر کی طرح سیدھا رہتا" پھر یہ بھی ہے"۔ ایک دوسرے ممبر نے مصرع اٹھایا۔ کہ شاعر جتنا غلط ہے اتنا ہی صحیح بنتا ہے"۔ "فکر کی بات نہیں"۔ مس شیپ شینک کرنل فردوسی کے اعتراض کو سمجھتے ہوئے بولیں۔ "عرفی کی داڑھی ہم شائستہ خاں کو لگا دیں گے"۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا" کرنل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ "شائستہ خاں کا اس میں بگڑتا ہی کیا ہے۔ مگر عرفی کے معاملہ میں تاریخ کی صداقت مسخ ہوتی ہے۔ بھئی میں طہران کی نیشنل گیلری میں عرفی کی تصویر دیکھ چکا ہوں"۔ کرنل صاحب بات کرتے کرتے اسٹیج پر چلے گئے اور عرفی بنے ہوئے کیپٹن خواجہ امین کو غالباً پہچان کر افسرانہ تحکم کے ساتھ بولے "عرفی ڈاڑھی کے بغیر ہو گا اور آدمیوں کی طرح سیدھا چلے گا۔ —— اٹن شن!" —— اور بیچارہ عرفی ایڑی سے ایڑی ملا کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ مس شیپ شینک عرفی کی لمبی سفید ڈاڑھی نوچ کر شائستہ خاں کے لگا رہی تھیں کہ گروپ کے "ابن بطوطہ" شیخ مصباح الدین، مولوی عبدالحلیم شرر کا کوئی ناول بغل میں دبائے اندر داخل ہوئے اور بوڑھے شائستہ خاں کو دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ پہلے زور سے ایک نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر گرج کر بولے:

"سنجر ولد! شائستہ خاں کے ساتھ یہ ناشائستگی! تاریخ کو لنگڑا کے ساتھ

یہ مذاق ہے، غازی شائستہ خاں وہ بطلِ جلیل اور مجاہدِ کبیر تھا کہ مغلِ اعظم محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی اس کی تلوار کی قسم کھاتا تھا۔"

اس بھبک پر سہم کر جب لوگ قدرے سنبھلے تو کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر میاں صاحب! شائستہ خاں بوڑھا بھی تو ہو سکتا ہے"

"نہیں۔ ہرگز نہیں"۔ میاں مصباح الدین کڑک کر بولے "مردانِ غازی مر سکتے ہیں، بوڑھے نہیں ہو سکتے"

"کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"بس نہیں ہو سکتے، کہہ تو دیا"

اس پر مس شیپ شنیک نے شائستہ خاں کی داڑھی جڑ سے اکھاڑ کر جہانگیر کے خزانچی لالہ نوبت رائے کی ٹھوڈی پر جما دی۔ یہ جھگڑا پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ کرنل فردوسی نے پائپ سلگاتے ہوئے ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑ دیا کہ عرفی اور طالب آملی دونوں بیک وقت جہانگیر کے دربار میں کبھی یکجا نہیں رہے۔ ان کے علم کے مطابق دونوں شاعروں میں سے کوئی ایک جہانگیر کے عالمِ شہزادگی ہی میں مر چکا تھا۔ اب یہاں عرفی و طالب کو یکجا دیکھ کر

کرنل صاحب کی خفگی کا یہ عالم تھا کہ اگر انھیں اجازت دی جاتی تو وہ عرفی وطالب میں سے کسی ایک کو اسی، وقت گولی سے اڑا دیتے۔ بذاتِ خود یہ کوئی ناقابلِ حل دشواری نہ تھی۔ مس شعیب شینک نے نہایت ٹھیک کہا تھا کہ عرفی یا طالب دونوں کے نہ ہونے سے جہانگیر کی حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اگر شاعر دربار کے بغیر دربار سجتا ہی نہیں، تو قرعہ اندازی کر لو۔ مگر اتنے میں ادھر عرفی اور طالب کے حامیوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ اب یہ سوال عرفی وطالب میں سے کسی ایک شاعر کے انتخاب کا سوال یا ڈرامے کی کسی انتظامی سہولت یا ضرورت کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ مغلوں کی پوری تہذیب و ثقافت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے جذبات اتنے کھول اٹھے کہ خود "ظلِ ہمایونی عالم پناہ شہنشاہِ جہانگیر" یعنی مسٹر الطاف حسین لودھی تاجِ سلطانی اور چترِ خسروی کو ایک طرف ٹیک کر اس بحث میں کود گئے جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس صحبت میں ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ ہی ترک کر دیا گیا۔

ڈرامہ کی ناکامی کا ہمارے گروپ پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اگرچہ خود ہمیں پر عائد ہوتی تھی مگر چونکہ اپنے آپ کو مطعون کرنے کی بہ نسبت دوسروں کو الزام دینا ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم لوگ کلب سے بیزار ہو گئے

اس واقعہ کے بعد ہم اس قطعی نتیجہ پر پہنچ گئے کہ غلامی کے زمانہ میں اندر ہی اندر ہماری قوم کے صاف دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک یہ لوگ جو کلبوں اور جمخانوں میں پروان چڑھتے رہے۔ ایک ہم لوگ جو گلیوں اور کوچوں میں گھومتے پھرے۔ صدیوں کے بعد دونوں ٹکڑے اب اس کلب میں جوڑے جا رہے تھے۔ مگر اے کاش فاصلوں کی مسافت میلوں میں ناپی جا سکتی! استاد عرفی اور طالب آملی میں سے کوئی ایک یقیناً بہت پہلے مر چکا تھا۔

بڑے کلب سے نکل کر گروپ نے ایک نئے کلب کی بنیاد رکھ دی "آزاد کلب"۔ آرزو یہ تھی کہ نئے کلب میں اپنے قومی و تہذیبی نقوش کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ مساوات و آزادی اس کلب کے بنیادی پتھر تھے۔ مگر چونکہ اس سے پہلے گروپ کو کسی چیز کی بنیاد رکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا لہذا آزاد کلب کی بنیاد آزادی سے زیادہ بے قاعدگی پر جا پڑی۔ آزاد کلب کی رکنیت اور یتیم خانہ ترجمان الاسلام کی رکنیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کا کلب یا چلنے میں نہیں آتا یا تھمنے میں نہیں آتا۔

کلب کا پورا ڈھانچہ امداد باہمی کے اصولوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ممبروں کو چندہ ادا کرنے سے پہلے اپنے حصہ کی کرسی "ادا" کرنا پڑتی تھی بلکہ ایک عادت

تک تو کرسی کے علاوہ کسی نوع کا کوئی چندہ تھا ہی نہیں۔ کلب کی اپنی عمارت ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہم اس سے پہلے کئی کلبوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ جب ان کی اپنی عمارت بن گئی، تو خود کلب ٹوٹ گئے۔ یوں بھی آزاد کلب کو کسی مقام کا پابند کرد نیا چہ معنی دارد۔ چنانچہ ابتداء میں کلب کو کبھی شہر کے ایک اسکول میں رکھا گیا، کبھی دوسرے میں۔ جب تقریباً تمام اساتذہ اور طلبا سے کلب کے شاعروں فن کاروں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو آزاد کلب کو ایک افغان ہوٹل سے ملحق لسفید زمین کے ایک کشادہ قطعہ میں لا کر اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اتفاق دیکھئے کہ کلب کی جڑیں اسی زمین میں سرسبز ہوئیں، قبولیت کا دور یہیں آ کر شروع ہوا جو شروع ہو کر پھر تھمنے میں نہیں آتا۔ چائے، قہوہ، شربت وغیرہ طلب کرنے پر افغان ہوٹل سے نقد و ادھار آجاتے تھے۔ کرسیاں افغان ہوٹل کا زنانہ۔ دل اور شاعر مزاج مالک رانجھا خاں رانجھارات کو سمیٹ کر ہوٹل میں رکھ دیتا تھا۔ کھیل کود سے ممبروں کو کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ یہاں محض بیٹھنے اور خالص گپ لڑانے کے لئے آتے تھے۔ تاہم بیٹھ کر کھیلے جا سکنے والے

بعض معروف کھیلوں کا اہتمام بھی موجود تھا۔ افغان ہوٹل کا مستعد ریڈیو ہوٹل کے گاہکوں، سڑک کے راہگیروں اور آزاد کلب کے ممبروں کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف تھا ـــــــ اور کیا چاہتا ہے دیوانے!

رکنیت پر کوئی خاص قید نہ تھی۔ صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لئے چند ہی دنوں میں آزاد کلب کی جغرافیائی اور معنوی سرحدیں افغان ہوٹل سے جا ملیں۔ گ

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے

بذاتِ خود یہ بری بات نہ تھی مگر سرزد ایسے برے طریقے سے ہوئی کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے خود ممبروں کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آزاد کلب چل رہا ہے یا افغان ہوٹل۔ "بندہ وصاحب ومحتاج وغنی" ایک نہیں ہوئے تھے، باہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ شاعروں کی منڈلی کسی میز پر میر تقی میر کو لئے بیٹھی ہے کہ گھی کے کسی موٹے تازے بیوپاری نے اپنا گھی کا کنستر لا کر عین میر تقی میر کے سر پر رکھ دیا۔ شعرا کو گھی سے، گھی والے کو میر تقی میر سے کوئی واسطہ نہیں مگر کلب سے دونوں کا واسطہ ہے۔ شامت کا مارا کوئی افسر اپنے ادب و تمدن کے عشق میں گرفتار آزاد کلب میں آنکلتا تو راشن کے ڈپو ہولڈروں، عام دکانداروں اور شہر کے

پیشہ ور خوش آمدیوں کا ایک ہجوم اس غریب کو یوں گھیر لیتا جیسے بچوں کی بستی میں کوئی ریچھ والا آ نکلا ہو۔

یہ بات نہ تھی کہ یہ آزاد کلب شہر کے معززین کی سرپرستی سے یکسر محروم تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ شرفا ہمارے حصے میں آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کچھ اس سرحد پر کھڑے تھے جہاں دولت و شرافت کے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور ذہن و فکر کی بالیدگی راستہ ہی چھوڑ دیتی ہے۔ ان میں سے بعض رئیس زادوں کی قسمت پر اوّل اوّل ہمیں بڑا تاؤ آتا کہ دیکھو منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہو گئے ہیں اور بیٹھے کیا مزے کر رہے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان سے زیادہ قابلِ رحم حالت شاید کسی کی نہ ہو۔ انھیں سرے سے یہی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندگی کے بے معنی خلا کو پورا کیونکر کیا جائے؟ جو قدرے ہوشمند تھے انھوں نے سیاست کا چسکا پال رکھا تھا۔ بعض عالی ظرف انتخابات کے معرکے جیتنے کے لئے نہیں ہارنے کے لئے لڑتے تھے۔ وزارت بڑے کلب میں تھی، جمہوریت آزاد کلب میں۔ جلسہ کہیں بھی ہو نعرے کی گونج یہیں سے پھوٹتی ہے۔

ہمارا گروپ اس صورتِ حال پر سخت پریشان تھا، ہم جس مقام کو ایک

مجلسی و تہذیبی مرکز بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ کہیں جمعدار گھسیٹے کی بیٹھک بن گیا تھا اور کہیں راجہ بازار۔ رؤسا بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ چمڑے ہڈی وغیرہ کے تاجر مول تول کر رہے ہیں، نمک ہلدی کے بیوپاری نمک ہلدی کے نمونے بھی ساتھ اٹھا لائے ہیں۔ لباس، وضع قطع، تہذیب وغیرہ سب کا دامن تار تار ہو کر کلب میں بکھرا پڑا تھا۔ اردو شاعری میں جس چاک گریباں کا ذکر آیا ہے اس کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہاں وہ صورت بھی نہ تھی۔ آزاد کلب میں لیڈری کی جا سکتی تھی، بازار سے سودا سلف خریدا جا سکتا تھا، لیکن نکھری ہوئی مجلسی زندگی کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ زندگی خود زندگی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

سب سے برا حال شعرائے کرام کا تھا۔ شعر سے زیادہ ان کا اپنا قافیہ تنگ تھا غزل پر غزل ہو رہی ہے مگر کلب میں سننے والا کوئی نہیں، سن کر سمجھنے والا کوئی نہیں، سمجھ کر داد دینے والا کوئی نہیں۔ الگ تھلگ ہو کر شعر بازی کرتے ہیں تو دوسرے لوگ کلب کے اس بیجا و غلط استعمال پر معترض ہوتے ہیں، بعض برملا ہنستے بھی ہیں۔ ادھر یہ آرزو کہ شام کو "مطلع" شروع ہو تو "مقطع" صبح کی خبر لائے۔ ادھر یہ قصہ کہ غزل کا سانس مطلع ہی پر گھونٹ دیا جائے۔ وہاں نمونہ کلام سے زیادہ نمونہ اجناس کی مانگ تھی۔

لپٹن کمپنی والے ایک زمانہ میں اپنے برانڈ کے فروغ کے لئے لوگوں کو مفت چائے پلایا کرتے تھے۔ آزاد کلب میں ذوقِ سخن کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے ہم نے ایک مشاعرے کا بندوبست کیا جو بدقسمتی سے بڑے کلب کے ڈرامے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔ جوش و خروش کی کمی نہ تھی۔ جوش و خروش اگر کم ہوتا تو مشاعرہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ کلب کے عام ممبروں نے مشاعرہ کو کسی میلے پر ہونے والا مجرا یا اس کے لگ بھگ کوئی تماشہ سمجھ لیا۔ وہ نہ صرف خود جوق در جوق تشریف لائے بلکہ محلے میں سے دوستوں، رشتہ داروں کو بھی فوج در فوج پکڑ لائے۔ یہ بظاہر، حوصلہ افزا علامت تھی مگر دراصل یہ اس قسم کی تعمیر تھی جس میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ جمہوریت کی طرح مشاعرہ بھی ان پڑھ لوگوں کے بس کی چیز نہیں۔ آپ مبالغہ سمجھیں گے مگر میں واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ جس وقت سیکرٹری نے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کی غرض سے مشاعرہ گاہ پر جائزہ لینے والی ایک نظر ڈالی تو سرسری اندازے کے مطابق سامعین اور سامعین کے حقّوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ شعراء کی گنتی بھی اگرچہ بہت کافی تھی لیکن ان بٹیروں سے کم ہی تھی۔ جنگو بٹیر بازی کے دلدادہ معززین مٹھی میں دباتے ہوئے مشاعرہ سننے چلے آئے تھے۔ شعراء ان سامعین

کو دیکھ کر ہی لرز اٹھے لیکن حضرتِ داغ کی پیروی میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک پھر بھی غنیمت تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی احتمال تھا کہ سامعین ڈھنگ کی داد نہیں دے سکیں گے مگر کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ کلام میں سے، شترگربہ وغیرہ بھی نہیں پکڑ سکیں گے لیکن مشاعرہ شروع ہونے پر خدا معلوم سامعین پہلے شاعر کے کلام یا اس کی صورت پر ہی اس طرح بھڑک اٹھے کہ آزاد کلب کا سارا میدان قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ان قہقہوں میں تمسخر یا استہزا یا تذلیل کا جذبہ یا ارادہ شامل نہ تھا۔ ان کی خصوصیت وہ بے ساختہ و بے قابو مسرت تھی جو ناگہانی و بے اندازہ حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ انھیں یہ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ شعر سننے کے بعد وہ کریں تو کیا کریں۔ شعر سن کر اگر وہ قہقہہ بھی نہ لگاتے تو میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے دل میں سخت شرمندہ یا پشیمان ہوتے چنانچہ تین چار شعرا گزر جانے کے بعد جب لوگ سمجھ گئے کہ مشاعرہ یوں ہی کچھ ہوتا ہے تو اکثر معززین شاعر سے زیادہ بیئر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مشاعرہ تو خیر شعرا کی سخت جانی کے طفیل جوں توں کر کے ختم ہو گیا لیکن اس دن سے ہم لوگ برابر اس فکر میں غلطاں ہیں کہ اس کلب کو توڑا کیسے جائے۔ آزاد کلب کچھ اس وارفتگی سے چل پڑا ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔

خاندانِ کیخسرو

سلطان راجہ مبارز خاں حکمرانوں کے ایک معزول بلکہ اب دو صدیوں سے نوگویا مفلوج کیخسرو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ "چشم و چراغ" میں نے یونہی از راہِ اخلاق و مروت ہی نہیں کہہ دیا بلکہ وہ لفظاً و معناً یعنی کیا محاورہ اور کیا روزمرہ ہر لحاظ سے اپنے خانوادے کے چشم و چراغ واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً چشم کو لیجئے اور اتفاق دیکھئے کہ سلطان مبارز خاں صرف ایک ہی چشم رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی جنگل میں ایک نوآموز عقاب کو —— "جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے" کی مشق کرا رہے تھے کہ نامراد پلٹ کر سلطان صاحب کی پوری

ڈھیلے پتلی سمیت صاف کر گیا۔ لوگوں نے پتھر کا ڈھیلا ڈلوانے کی رائے دی مگر پتھر کی آنکھ ان کے مذاقِ لطیف پر گراں گذری۔ بعض ڈاکٹروں نے یورپ جانے کا مشورہ دیا کہ شاید وہاں کے ماہرین کسی مردہ انسان کی کوئی ایسی نیم مردہ آنکھ ڈال دیں جو تھوڑا بہت دیکھ بھی سکتی ہو۔ لیکن سلطان مبارز خاں اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ ایک تو انھیں سرے سے سفر کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ ریل جہاز وغیرہ میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ جمہوری طرز کا سفر کرنا انھیں سخت ناگوار تھا۔ پھر یورپ جا کر انسانی آنکھ ڈلوانے میں ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ نہ معلوم کس خوانچہ فروش کی آنکھ ان کے سر تھوپ دی جائے جو خدانخواستہ ان کی زندگی کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دے۔

سوچ بچار کے بعد آخر طے پایا کہ حکمرانوں، کشور کشاؤں کو باز و عقاب کی آنکھ ہی کچھ زیب دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ کے اصول پر اُسی عقاب کی آنکھ نکلوا کر ان کی آنکھ میں فٹ کر دی گئی۔ مگر یہ آنکھ دور سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ باز کی آنکھ ہے کیونکہ ہر وقت باز رہتی ہے۔ کچھ یہ آنکھ، اس کے اوپر اُن کی پھیلی ہوئی گھنیری مونچھ، آدمی اگر کچھ زیادہ غور نہ کرے تو راجہ سلطان مبارز خاں ایک اڑتا ہوا عقاب معلوم ہوتے ہیں اور

چڑی، فاختہ، کبوتر وغیرہ کی قبیل کے امن پسند پرندے تو سچ مچ ان کو دیکھتے ہی اُڑ جاتے ہیں۔ البتہ کوؤں کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ یہ باز کی مری ہوئی آنکھ ہے اور بازوں سے غالباً وہ خصومت بھی رکھتے ہیں کہ جب موقعہ ملتا ہے یمین و یسار سے اس آنکھ پر ٹھونگ مار جاتے ہیں۔ لہٰذا بیچارے سلطان مبارز خاں دستار پر اکثر غلیل باندھ کر نکلتے ہیں۔

یہ تو تھی چشم ـــــــ رہا چراغ تو گو زندگی کی چہل پہل کی شمع تو ان کے ہاں مدت سے گل پڑی ہے لیکن حویلی کے ایک تہ خانے میں جس کو توشہ خانے کہتے ہیں، پیتل کا ایک چراغ پچھلی کئی صدیوں سے روشن ہے۔ روایت یہ ہے کہ خاندانِ کیخسرو کے مورثِ اعلیٰ سلطان راجہ ممارا خاں نے بہرام پور کے ایک قلعے کی تعمیر یا تسخیر (اغلباً تسخیر کیونکہ تعمیر کی اُنھیں فرصت ذرا کم نصیب ہوئی) کی خوشی میں یہ چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کیا تھا۔ اور یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کو ہرگز کبھی بجھنے نہ دیا جائے۔ چراغ کے ساتھ سلطان مرحوم نے اپنی ایک شمشیرِ آبدار بھی توشہ خانہ میں رکھی تھی مگر چونکہ اس کے بارے میں کوئی وصیت کرنا بھول گئے تھے، لہٰذا شمشیر تو بعد میں کوئی مغل صوبے دار اٹھا کر لے گیا ـــــــ مزید بعد وہ ایک بھونسلہ سردار اور پھر لارڈ کارنوالس کے اردلی

کی کمر میں دیکھی گئی —— ہاں چراغ آج تک برابر جل رہا ہے!

قلعہ بہرام پور کو اس خاندان کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تاریخ اصل میں چلتی ہی اسی قلعے سے ہے، مگر بدقسمتی سے قلعے کو کوئی خاص تاریخ نہیں نصیب ہو سکی۔ قیاس یہ ہے کہ ایک طوائف الملوکی میں، جو اس زمانے میں اکثر پھیلا کرتی تھی، یہ قلعہ سلطان محمار آخاں کے ہاتھ پڑ گیا اور دوسری طوائف الملوکی میں ہاتھ سے نکل گیا اور یہ دوسری طوائف الملوکی کچھ ایسی بے قابو ہو کر پھیلی کہ اب اس قلعے کے آثار تک بھی کہیں نظر نہیں آتے ویسے لوگ کہتے ہیں کہ بڑا عالی شان قلعہ تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پرگنے میں بعض دوسرے قبائل کے جو دس بارہ قلعے آج تک موجود ہیں، یہ دراصل بہرام پور کے قلعے ہی کے دمدموں، کنگروں، برجوں اور دیواروں کو اکھاڑ کر بنائے گئے تھے اور یہ خیال قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سب قلعے وضع قطع میں خلیرے، ممیرے، پھپھیرے بھائی نظر آتے ہیں —— قلعے کی بنیاد میں جو پتھر تھے، اُن سے پہلے تو بہرام پور کے لوگوں نے اپنے مکان بنوائے، بعد میں وہی پتھر ان کی قبروں پر صرف ہوئے اور آج نہ بہرام کا قلعہ موجود ہے، نہ وہ قصبہ، نہ وہ لوگ، نہ ان کی قبریں۔

کیخسرو خاندان قلعے سے ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ رکھ کر جو بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں گھومتا ہوا پایانِ کار اس حویلی میں پناہ گزین ہوا، جو اصلاً تو ایک عظیم قلعہ نما حویلی تھی مگر اب عرصے سے اس کا اصطبل ہی قابلِ رہائش رہ گیا تھا جس میں وقتاً فوقتاً جابجا دیواریں اٹھا کر، یا جہاں دیواریں نہ اُٹھ سکیں وہاں ٹاٹ تان کر زنان خانے، دیوان خانے، توشہ خانے، ہاتھی خانے، وزیر ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں وغیرہ بنا لی گئی ہیں۔

معزولی کے وقت پہلے سلطان کو معقول موروثی پنشن کے ساتھ کچھ زرعی جاگیریں بھی ملی تھیں۔ مگر کئی نسلوں کی تقسیم و تفریق کے بعد اب یہ آمدنی محض ایک علامتی امتیاز رہ گئی جو ہرگز اس لائق نہیں کہ "وضعِ سلطانی" کے بوجھ کو جو ہاتھیوں سے نہیں اُٹھتا، سنبھال سکے مگر بوڑھا سلطان مبارز خاں اسی بوجھ کو اپنے سر کا تاج سمجھتا ہے۔

محل ڈھیر ہو چکا لیکن ڈیوڑھی پر چوبدار کھڑا ہے۔ مصاحب کوئی نہیں مگر دیوانِ عام موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ نشست و برخاست کے جو قواعد سلطان راجہ حمارا خاں کے وقت بندھ گئے تھے، ان معمولات پر آج بھی نہایت باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ اِدھر آفتاب سوا نیزے پر بلند ہوا، دیہ معلوم نہ

ہو سکا کہ نیزہ دے کہ آفتاب کو ناپتا کون ہے، ادھر آپ محل سرا سے سوا جریب چل کر دالان کے ایک چبوترے پر رونق افروز ہو گئے۔ سامنے پیچوان رکھا ہے اور بازو میں ایک طشت کے اندر کلیجی کی بھنی چند بوٹیاں، مونگ پھلی کے مغز، باجرہ، سونف اور مصری وغیرہ کے علاوہ سبز چارے کی چند چھوٹی چھوٹی گڈیاں رکھی ہیں۔ سلطان صاحب نے حقے کے دو کش لے کر آواز دی:

"وزیر ڈیوڑھی"

اور مولوی اللہ بخش جو مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، ڈیوڑھی کی ایک بغلی کوٹھڑی میں سے نکل کر دست بستہ حاضر ہو گئے

"کوئی عرضی پیشی؟" سلطان نے پوچھا۔

"حضور سب خیریت ہے"۔ وزیر ڈیوڑھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا اور سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"میر شکار"

اس آواز پر میر شکار جو دراصل نذرو مراثی ہے، ہاتھ کے انگوٹھے پر باز بٹھائے آ گیا۔ سلطان نے باز کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور طشت میں سے کلیجی کا ایک ٹکڑا اٹھا، باز کی چونچ میں رکھ دیا۔ باز کو کھونٹی سے باندھ کر تھوڑی دیر

میں یہی نذر، مراثی دار، داروغہ اصطبل کی حیثیت میں سلطان کے سمرقندی ٹٹو کو باگ سے پکڑ لایا، جس کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے سبز چارے کی ایک گڈی کھلائی اسی طرح پھر یکے بعد دیگرے محل کے طوطے، بٹیر، مرغ اور بکریاں سلام کو حاضر ہوئیں اور اپنے اپنے حصے کا چارہ دانہ لے گئیں۔

اب چار ساعتیں آفتاب کی طرف تکنے کے بعد یہ آفتاب کے کسی زاویے پر منحصر رہے کہ آپ چبوترے سے اٹھ کر دیوانِ خاص میں جائیں گے، توشہ خانے میں یا واپس محل سرا میں۔

حویلی سے باہر آپ شاذ ہی قدم رکھتے ہیں۔ ایک تو وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ: ع

نکل کر پھول سے خوشبو ذلیل و خوار ہوتی ہے

——— اور دوسری بڑی قیامت یہ ہے کہ ان کے بزرگ ہاتھیوں پر نکلتے تھے۔ پھر چار گھوڑوں کی فٹن پر نکلتے رہے۔ رفتہ رفتہ چار کے دو گھوڑے رہ گئے۔ اور اب سلطان صاحب کے پاس جو سمرقندی ٹٹو ہے۔ وہ "مجذوبیت" کے اس مقام پر ہے کہ اگر فٹن کو کھینچنے لگے تو فٹن اس کو کھینچ کر لے جائے پھر خود فٹن کا بھی یہ حلیہ کہ اگر آپ اس میں بیٹھ کر نکلیں تو یوں معلوم ہو گویا کسی عاشق کا جنازہ

دھوم سے نکل رہا ہے۔

توشہ خانہ تو ہاتھی خانے کی طرح شاید خالی پڑا ہے۔ البتہ دیوانِ خاص کی بعض چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

مخملیں غلاف میں ایک بہت بڑی منقش، مجلّا و مطلّا کتاب رکھی ہے جس میں سلطان حمار اخاں سے لے کر آج تک کے جملہ سلاطین کے روزنامچے درج ہیں۔ ابتدائی دور کے روزنامچے تلواروں اور یلغاروں کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ تلوار ہر وقت نیام سے باہر رہتی تھی۔ نیام میں غالباً راشن بھرا رہتا تھا شہسواری کا یہ عالم تھا کہ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر سو جاتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خود تو گھوڑے کی پشت پر سو رہے ہیں اور گھوڑا میدان مار کر قلعہ میں واپس بھی آ گیا۔ ایک سلطان نے محمد غوری کے تعاقب میں گھوڑا ڈالا تو حالانکہ محمد غوری ابھی جہلم کی پہاڑیوں میں کہیں بھٹک رہا تھا کہ سلطان، غزنی پہنچ کر قتل بھی ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد غوری بھی بچ کر نہ جا سکا۔ کیونکہ اس کو ادھر کے ایک گوہر قبیلہ نے کیخسرو سلطان کے شبہ میں قتل کر دیا۔

دوسرا دور شورشوں، خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ کیخسرو سلاطین، اس زمانے میں کبھی دشمنوں سے اور کبھی خود اپنے آپ سے لڑتے

رہے ہے۔ اِس دَور میں کوئی دس پندرہ چچے اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے چنانچہ بھتیجوں نے چچا بننے کے خوف سے بعد میں اپنے بھائیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مصروفیتِ پیکار اور فتح و شکست کی بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ رانیوں کو میدانِ جنگ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح ہوتی تو دوسروں کی رانیاں گھر میں ڈال لیتے۔ اولادِ نرینہ کا سلسلہ عموماً دشمن رانیوں ہی کے بطن سے قایم رہا۔

ہاتھی، شیر، چیتے، عقاب وغیرہ کے شکار کے رسیا تھے۔

تیسرے دَور میں اگرچہ معرکہ جوئی کا ولولہ تو سرد پڑ چکا تھا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اگر سونے کی کوشش کرتے تھے تو گر پڑتے تھے۔ تاہم ہنوز خاصہ دم باقی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں کا "طوطا" بول رہا تھا۔ سکھوں سے ابتداً ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے مگر پھر ایک ذرا سی غلط فہمی پر ان سے جنگ چھڑ گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ نہال سنگھ یا نِدھ سنگھ نامی ایک سکھ جرنیل مع لشکر ان کے ہاں اُترا ہوا تھا کہ ان کے ایک سادہ لوح رکابدار نے مدارات کے طور پر حقہ لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر وہ تلوار چلی کہ جب تلوار تھمی ہے تو اس علاقے پر انگریزوں کا تسلط قایم ہو چکا تھا۔

خاندانِ کیخسرو میں یہ لڑائی ——— "حقوں کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے
اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی کامیابی میں کیخسرو خاندان کے اس حقے
کا بہت اہم حصہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بعض انگریز حکام چاندی،
تانبے، پیتل وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے حقے تحائف و یادگار کے طور پر اپنے
ڈرائنگ روم میں رکھتے اور ولایت بھیجتے تھے۔

چوتھے دور میں، جو راجہ سلطان مبارز خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے،
روزنامچہ میں کچھ اس قسم اندراجات ملتے ہیں:

"دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے حقہ پیتا رہا"

"سلطان طہماسپ خاں کے کمربند کو دیمک چاٹ گیا"

"مردان سے عمدہ نسوار منگوائی ہے"

"چترالی عقاب بیمار ہے"

"اس زور کی آندھی چلی کہ دیوانِ عام کی چھت اڑ گئی"

"ہاضمہ سخت خراب ہے"

"کچھ بھی نہیں"

یہ اندراجات بھی سلطان مبارز خاں کے ابتدائی روزنامچوں میں ملتے ہیں۔

ورنہ بعد میں تو انھوں نے اپنے شاہی روزنامچہ میں دورہ پر اِدھر آنے والے افسروں سے ریمارکس اور سرٹیفکیٹ لکھوانے شروع کر دیئے ہیں۔ پونا مارس کے ایک میجر ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہڈسن صاحب سلطان مبارز خاں کی مونچھوں، ان کی حویلی کی محرابوں، باز کی ٹانگوں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں اور ان کے باورچی خانے کی تعریف میں پورے دو صفحات لکھ گئے ہیں۔ آخری ریمارک ایک سب ڈویژنل افسر مسٹر ڈایلین ہارٹلے کا لکھا ہوا ہے جس پر یکم اپریل ۱۹۴۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ آزادی کے بعد سے روزنامچہ خالی پڑا ہے۔ سلطان مبارز خاں کہتے ہیں کہ اب ہم ریمارک لکھوائیں تو کس سے لکھوائیں۔ جو افسر آتا ہے وہ پہلے کبھی نہ کبھی اسی علاقے میں قانونگو، گرداور، تحصیلدار، تھانیدار رہ گیا ہے رہے بڑے سینیئر افسر تو وہ نہ معلوم کس افراتفری میں مبتلا ہیں کہ دورے پر کبھی اس طرف آتے ہی نہیں۔ آتے ہیں تو انھیں شکار کھیلنے کا شوق نہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے ریمارک لکھواتے ہوئے کچھ شرم سی آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اگر تاریخی واقعات کی اوسطی صدی نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان خاندان کے سلاطین اکثر و بیشتر دوسرے مسلمان سلاطین

کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

باز و عقاب سے شکار کھیلنا کیخسرو خاندان کا مرغوب مشغلہ رہا ہے۔ آج بھی کوئی بیس پچیس نامی گرامی عقاب، جن کی کھال میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ خاص کی دیواروں پر جابجا ٹنگے نظر آتے ہیں۔ ہر عقاب کے نیچے ایک تختی لگی ہے جس پر خطِ نسخ کوفی میں فارسی کا کوئی مشکل سا شعر کندہ ہے اور اس کے نیچے مرحوم عقاب کی مختصر سی سوانح عمری ---- آخری عقاب وہ ہے جس کی آنکھ نکلوا کر خود سلطان مبارز خاں نے اپنی آنکھ میں فٹ کروا رکھی ہے۔

دیوانِ خاص میں آبنوس کا ایک بہت بڑا چوبی بورڈ آویزاں ہے جس پر عہد بعہد کے مصوروں نے سلاطین کیخسرو کی تصاویر بنا رکھی ہیں۔ صورتِ اعلیٰ سلطان عمار آغا خاں کی تو قدِ آدم تصویر موجود ہے۔ مگر باقی سلاطین کے گردن تک صرف چہرے ہی دکھائے گئے ہیں۔ لیکن اس سے تصویروں میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی کیونکہ بعد کے تمام سلاطین وہی سلطان عمار آغا خاں کا چغہ، کمر بند اور پاجامہ پہنتے تھے۔

چہروں میں بھی مصوروں نے زیادہ کمال مونچھوں پر صرف کیا ہے کہ مونچھ اس خاندان کی قومی و تاریخی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ تصاویر کا یہ بورڈ سلسلہ

گویا مونچھوں کا ایک کیلنڈر ہے جس میں بڑی بڑی جابر، گھنی اور گھمبیر، بلند۔ یا لامونچھیں نظر آتی ہیں۔ بعض سلاطین کے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ وہ مونچھوں کے دونوں کونوں پر الگ الگ دو تلواریں لٹکا کر چلا کرتے تھے۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ ان مونچھوں کے طول بلد اور عرض بلد سے خاندانِ کنجیرو کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جن سلاطین کی مونچھیں شاندار تھیں۔ ان کا دورِ حکومت بھی شاندار ثابت ہوا۔ خود بوڑھے سلطان مبارز خاں کی مونچھیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس پیری و ضعیفی میں اتنی گنجان مونچھیں یہ کہاں سے لائے ہیں۔ اور اتنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ اتنا بوجھ لے کر کس طرح چلتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سلطان مبارز خاں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ان کی مونچھوں کو دوسرے میں، تو مونچھوں والا پلڑا شاید کچھ بھاری ہی نکلے۔ بہر حال ان کی مونچھیں گھنی بھی ہیں، گنجان بھی ہیں، اور ان کا رُخ بھی ہنوز اوپر کی طرف ہے اور سلطان مبارز خاں خوش ہیں کیونکہ خاندان کا ستارۂ عروج انھیں مونچھوں سے بندھا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ستارہ بلندی کی طرف جا رہا ہے۔

ڈاکٹر اعظم کریوی کے ساتھ دو سال

آخری دو خاکے تخیلی نہیں حقیقی ہیں ——

اپنے دو شفیق اور پیارے بزرگوں کی یاد میں چند

تاثرات!

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کا تذکرہ لکھنے

میں میرے عزیز دوست اور مولانا کے چہیتے شاگرد

میجر مسعود احمد نے میرا ہاتھ بٹایا ہے۔

(ف)

ابوالاثر حفیظ جالندھری میرے اس احسان کو کبھی نہیں بھولتے کہ میں نے انھیں پنجاب کی ایک محترم و بزرگ شخصیت راجہ فاضل محمد خاں مرحوم سے متعارف کرایا تھا۔ میں حفیظ صاحب کے اس احسان کو نہیں بھول سکتا کہ انھوں نے مجھے ڈاکٹر اعظم کریوی سے ملایا۔

میں اُس پود سے ہوں جس کا بچپن ڈاکٹر اعظم کریوی کی کہانیوں کا شباب تھا۔ ہوش کی آنکھیں کھلیں تو منشی پریم چند کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی کو افسانہ نگاری کے منظر پر چھائے ہوئے دیکھا۔ ہم دیہات والوں کو اُن کی کہانیاں اپنی کہانیاں

معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کے لکھنے کا انداز سادہ۔ رسیلا اور دل نشین تھا مگر بہت بعد میں ـــــــ جب ادب ہی کے واسطے سے ادب کے مشاہیر سے خود میری ملاقاتوں کا موقع آیا تو ڈاکٹر اعظم کریوی کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا شخص بھی نہ مل سکا جو انھیں ذاتی طور پر جانتا ہو۔ رفتہ رفتہ باقی دنیا کی طرح میں بھی انھیں بھول گیا ـــــــ یہ ستارہ ڈوب چکا تھا۔ ع

آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک

جناب حفیظ جالندھری ہر چوتھے پانچویں برس کسی نہ کسی سرکاری محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہو جاتے ہیں۔ جس کا خمیرہ وہ خود ہی اُٹھاتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں جب وزارتِ دفاع میں اُن کو "ڈائریکٹر آف مورال" کا عہدہ پیش کیا گیا تو اپنے نائب کی حیثیت سے انھوں نے مجھے بھی طلب کر لیا۔ ڈاکٹر اعظم مرحوم سے میری ملاقات اسی محکمہ میں ہوئی اور پھر تقریباً دو برس تک ہم ایک دوسرے کی زندگی میں کچھ اس طرح داخل رہے کہ اُن حالات اور اتنی مدت میں ایک دوسرے سے گہری محبت یا شدید نفرت کے علاوہ کوئی اور منطقی کیفیت ممکن ہی نہ تھی۔

محکمہ نیا نیا کھڑا ہوا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ابھی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ڈائریکٹر (حفیظ) اور ایک ڈاکٹر (اعظم) اس کی کل کائنات تھے۔ دفتر ملیر چھاؤنی

تھا۔ میرے لیے کراچی۔ ملیر۔ محکمہ۔ دفتر سب اجنبی تھے۔ ملیر کے بارے میں اُڑتا یہ سُن رکھا تھا کہ وہاں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو کھوئے بغیر کوئی مقام پایا ہی نہیں جا سکتا۔ میں حفیظ صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع تو دے چکا تھا۔ مگر شاعروں کے محکمہ سے مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ اسٹیشن پر مجھے کوئی لینے بھی آئے گا۔ تردد بھی کیا گیا تو منہ اندھیرے ملیر کے کسی گوشے سے اُٹھ کر بروقت کوئی اسٹیشن پر پہنچ بھی سکے گا؟ لیکن تڑکے کے سرمئی جاگتے ہوئے سے دُھندلکے میں گاڑی جب ڈرگ روڈ پر رُکی تو یہ دیکھ کر بڑی مسرت اور مسرت سے زیادہ حیرت ہوئی کہ حفیظ صاحب خود اسٹیشن پر موجود تھے۔ اُن کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جو صوبیدار کی فوجی وردی میں ملبوس تھے۔

پلیٹ فارم پر معانقے کا عمل شروع ہوا تو حفیظ صاحب نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "انھیں جانتے ہو کون ہیں؟ —— یہ ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں۔ میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھے ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس نئے محکمہ میں ہمارے رفیقِ کار تھے۔ میں معانقے کے لیے حفیظ صاحب کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر ڈاکٹر اعظم کریوی سے لپٹ گیا۔

دفتر میں میرا اور اُن کا بڑا گہرا سابقہ تھا۔ افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے حفیظ صاحب ہر چند جزئیات پر نگاہ رکھنے والے افسر ہیں، تاہم آخر ڈائریکٹر تھے۔ محکمے کو انتظامی لحاظ سے اُٹھانا یا بٹھانا میرے اور ڈاکٹر صاحب کے سپرد تھا۔ چنانچہ ہم نے ڈائریکٹر صاحب کو ایک باعزّت فاصلے پر سب سے بڑا کمرہ دے کر دو ہم بغل کوٹھڑیوں میں اپنے اپنے دفتر اس صورت سے جما لیے کہ ایک دوسرے کی صورت ——— جب ذرا گردن اُٹھائی دیکھ لی!

کام کچھ اس نوعیت کا تھا کہ عام دفتری ضوابط سے مختلف ضوابط وضع کیے بغیر محکمہ اپنی جگہ پر کھڑا تو رہ سکتا تھا، چل نہ سکتا تھا۔ نیا نیا محکمہ نئے نئے مسائل، میں اور ڈاکٹر صاحب پہروں سر جوڑے بیٹھے رہتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آ گئے۔ دفتر کے علاوہ دفتر سے باہر بھی اکثر یکجائی رہتی۔ ملیر میں یوں بھی ڈھب کی سوسائٹی کا قحط تھا، کچھ ہماری رہائش کی یہ صورت تھی کہ سلاٹ لائن کی جس سڑک کے ایک کنارے پر دفتر تھا، دوسرے بازو پر ٹھیک سامنے حفیظ صاحب کا بنگلہ تھا، درمیان میں ایک مکان چھوڑ کر میں رہتا تھا، اور بازار کی طرف چند قدم پر ڈاکٹر صاحب۔ دفتر اور گھر اتنے قریب ہوں تو رفتہ رفتہ دفتر اور گھر کا امتیاز ہی اُٹھ جاتا

ہے۔ ہمارے دفتر کھولنے کا تو ایک وقت مقرر تھا مگر بند کرنے کا کوئی ٹھیک نہ تھا۔ لہٰذا اوقات گھروں سے شام کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔ دفتر سے اُٹھتے تو حفیظ صاحب کے ہاں جا بیٹھتے۔ ظاہر ہے اس کیفیت میں ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف ہوئے بغیر میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ سن و سال کے فرق کے باعث اگر میں ذرا سا فاصلہ قائم بھی رکھنا چاہتا تو وہ آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیتے۔ حجاب و تکلف کے وہ سخت مخالف تھے۔ دفتر میں پہلے ہی روز مجھ سے کہنے لگے، میں تو آپ کو بھائی صاحب کہا کروں گا اور فی الحقیقت میرے ساتھ اُن کا سلوک بڑے شفیق بھائی کا سا رہا۔ محکمانہ تعلقات بہت جلد دوستانہ محبت میں ڈھل گئے۔ ہم لوگ کسی مشترکہ دفتر کے کارکنان سے زیادہ ایک کُنبے کے افراد معلوم ہوتے، دُکھ سکھ کے شریک۔

ڈاکٹر اعظم کریوی کی شخصیت اور کردار کو میں اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہے ——— "حیرت انگیز" جب تک اُن سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں انھیں سچ مچ کا ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر تھے ہی نہیں۔ تمام عمر فوج کی نوکری میں گذاری۔ وہ رسالدار اعظم کریوی تھے۔ وہ اسی طرح کے "ڈاکٹر اعظم" تھے۔ جس طرح سکندر نام کا کوئی عام آدمی

"سکندرِ اعظم" کہلانے لگ جائے ——— یہ تو خیر لطیفہ ہوا، لیکن اُن کی زندگی کا جو بھی گوشہ سامنے آیا، حیرت انگیز پایا۔

وُہ بڑے پائے کے ادیب تھے مگر شکل و صورت کے علاوہ، اُن میں ادیبوں والی کوئی بات نہ تھی۔ خوبی نہ سہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادیبوں، فن کاروں کی سرشت و طبیعت میں تھوڑی بہت کاہلی، بے پروائی، بے قاعدگی، بے نیازی عموماً ضرور ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کسی کے اُوپر لگی ہوتی ہیں، کسی کے اندر بیٹھی ہوتی ہیں۔ مرحوم میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ کبھی تھی بھی تو اُس کا گلا گھونٹ چکے تھے۔ یہاں تک کہ اب وُہ اِن سب چیزوں کی ضد بن چکے تھے۔ معمولات کے اتنے پابند تھے کہ اتنے پابند آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ احساسِ فرض کا جذبہ اس قدر شدید، کہ اُن کی زندگی ایک سزا یا مشقت معلوم ہوتی۔ پاسبانِ عقل ہر وقت دِل پر مسلط۔ رات کو خواہ کسی وقت سوئیں علی الصبح اُٹھ بیٹھتے۔ آپ کوئی سا دِن چُن لیں، اگر بیمار نہیں ہیں تو صبح چھ بجے واکنگ کرتے ہوئے اور سات بجے کنجڑے کے ہاں گوبھی پالک خریدتے ہوئے ملتے۔

۱۹۵۱ء میں وُہ پنشن کی حد پر جا پہنچے تھے۔ زندگی کچھ اس بے دردی سے اُن کے اُوپر سے گذر رہی تھی کہ وُہ اپنی عمر سے بھی گویا پندرہ برس زیادہ عمر

نظر آتے تھے، رخسار پچک گئے تھے۔ ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ دُبلے پتلے، لاغر، کمزور، آنکھیں اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بلا کے مستعد، غضب کے چوکس اور چوبند۔ کارفرما و کارکشا۔ دیکھنے میں وہ تکان کا مجسمہ دکھائی دیتے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے وہ اس مقام پر تھے جہاں تکان خود تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔

اُس وقت اُن کی (غالباً) تین بیویاں زندہ موجود تھیں جو تین الگ الگ گھروں میں رہتی تھیں۔ ایک اڈکانز میں، دوسری مارٹن روڈ کے عقب میں، تیسری ناظم آباد میں یا شاید کسی دوسری بستی میں اور خود آپ بچوں کا "چورا" سمیٹے ہوئے ملیر چھاؤنی میں۔ ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی بائیسکل اُن کے پاس تھی، اُس پر سوار زمین کا گز بنے اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ملیر سے رات کے گیارہ بجے اُٹھے اور انتہائی دل جمعی سے بائیسکل پر کراچی روانہ ہو گئے۔ پھر دوسری صبح ٹھیک وقت پر دفتر میں موجود۔ گرمی ہو یا سردی ایک مسافت طے کرنے کے بعد دوسری منزل کی طرف چل پڑنے کے لیے انھیں اتنے وقفے سے زیادہ مہلت درکار نہ تھی کہ وہ ڈبیہ میں سے پان کا تکڑا نکال کر منہ میں رکھ سکیں۔ اُن کی گھریلو زندگی کا پھیلاؤ اُن کے وسائل کے

بس کا روگ نہ تھا۔ معاملات اُلجھے ہوئے بھی تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ محض اُن کی کاہلی یا بے پروائی کے سبب کوئی معاملہ اُلجھنے پائے یا دیر تک اُلجھا رہے جس وقت اُن کو جس مقام پر ہونا چاہیئے وہ وہاں ضرور ہوتے۔ اُن کی ٹیبل ڈائری کا ہر خانہ گھریلو اندراجات سے اٹا ہوتا۔ چھ تاریخ کو افتخار کی فیس نو کو بوبو امتحان، بارہ کو مارٹن روڈ پر لکڑی، پندرہ کو لاڑکانہ کا حساب، بیس کو بڑی بیگم کے گھی، چوبیس کو بچوں کو لے جانا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دھندے وہ اسی ٹوٹی ہوئی سائیکل پر انجام دے لیتے۔ انتظامِ خانہ داری میں اُن کی مشق و مہارت کا یہ عالم تھا کہ ازراہِ محبت میرے گھر کے بعض انتظامی امور بھی انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔

پھر جو مستعدی گھر کے دھندوں میں تھی اُس سے سوا دلچسپی دفتری فرائض میں۔ وقت کے پابند۔ ڈیوٹی کے پکے۔ کام میں تیز۔ دفتر کا کام اس لگن سے کرتے جیسے گھر کا کام کر رہے ہوں۔ وہی سچا تردد وہی بے اختیار تشویش، وہی بے انداز مخلصانہ انہماک، دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے حفیظ صاحب آوازیں دے رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب آئیے دن بھر کی محنت کے بعد اب کچھ گپ شپ ہو جائے مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ اب نئے سر سے

دفتر کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے ——— "حضرت مجھے تو ابھی معذور ہی سمجھئے۔ بہت کام بقایا پڑا ہے۔ آپ افسر سہی، محکمہ تو مجھی کو چلانا ہے"——— سامنے ٹیبل ڈائری کا خانہ چھوٹی اور بڑی بیگم کے درجنوں چھوٹے بڑے کاموں سے بھرا ہوتا۔ مگر وہ اس اطمینان سے بیٹھے رہتے جیسے ذہن میں کوئی خلفشار موجود ہی نہیں۔ حالانکہ ابھی انہیں اُسی شام کو دس گیارہ بجے انھیں اپنی ٹوٹی ہوئی بائیسکل پر پلیر سے کراچی جانا پڑتا۔

مزاج ایسا تھا کہ اس مزاج کا آدمی جہاں بھی مل جائے اُسے اُٹھا کر دفتر میں رکھ لینا چاہیئے۔ ملائم، متحمل، معاملہ فہم، معاملات پر اپنی ایک رائے بھی رکھتے موقع محل دیکھ کر اُس کا اظہار بھی ضرور کرتے، مگر سب کچھ اس سلیقہ کے ساتھ کہ گویا اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ ڈائریکٹر صاحب اُن کی رائے کو خود اپنی رائے سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کرتے تھے، افسر کو گھیر گھار کر اُس تک لے آتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت، اُس کی مقدار و معیار پر روشنی ڈالنے کا بھی وافر ملکہ تھا۔ کام نہ ہوتا تو پیدا بھی کر لیتے، حفیظ صاحب دفتری ڈرافٹوں میں شعر کی جامعیت کے قائل تھے، اور ڈاکٹر صاحب افسانوی پھیلاؤ کے۔ اُن کی خواہش ہوتی کہ

ڈرافٹ میرزا غالب کی غزل ہو، ان کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ میں تمہید، پلاٹ، مرکزی خیال، نقطۂ عروج سب کچھ ہو۔ نتیجہ یہ کہ کام پیدا ہوتا رہتا۔

مرحوم کو میں نے آرام سے فارغ بیٹھے کبھی نہ دیکھا بعض اوقات گمان ہوتا کہ فارغ بیٹھنے سے انھیں شاید تکلیف ہوتی ہے۔ دفتر تو خیر دفتر تھا، گھر پر بھی ملے تو ہمیشہ مصروف ملے۔ کبھی چارپائی کا بان اُدھیڑ رکھا ہے کبھی دھوتی باندھے گھر کی صفائی میں جٹے ہیں۔

کبھی نواسے نواسیوں کے حلقے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں کر رہے ہیں تو بائیسکل پر چڑھے کسی طرف کو چلے ہی جا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت عجیب بے چینی، ایک سیمابیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ملیر سے ڈیوٹی ٹرک لے کر ہم لوگ جب کبھی کراچی جاتے، آپ اپنی سائیکل بھی اُس میں رکھ لیتے۔ جہاں جہاں ٹرک نہ جا سکتا تھا، وہاں وہاں بائیسکل پر ہو آتے۔ بازار میں اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک معذرت کر کے یکبارگی غائب ہو جاتے۔ پھر خدا معلوم کہاں کہاں کا چکر کاٹ کر ناگاہ کسی موڑ پر آن ملتے۔ ابھی تھکے ابھی نہیں ہیں آرام اُن کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں اُن کی گفتگو پر بھی مشقت کا گمان ہوتا۔

جن دنوں اُن سے میری ملاقات ہوئی ہے، وُہ آہستہ آہستہ مر رہے تھے۔ صحت کمزور، آمدنی قلیل، تین چار کنبوں کی کفالت، اُن کا رنگ مرنے سے پیشتر ہی زرد ہو چکا تھا۔ جب تک فوج میں تھے بہت سی مراعات حاصل رہیں۔ فوج کے بعد خالی دو ڈھائی سو روپے ماہوار کی آمدنی اُن کے مختلف کنبوں کے حساب سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار سے زیادہ معنی نہ رکھتی تھی۔ لباس، خوراک رہائش ہر چیز چوپٹ ہو گئی تھی۔ اپنی ذات پر وُہ ایک کوڑی بھی نہ خرچ کرتے تھے۔ وُہ دراصل اب اپنے لیے جی ہی نہیں رہے تھے۔ اُن کی مثال تانگے کے ایک ایسے عمر رسیدہ، گرسنہ، زخمی گھوڑے کی سی تھی، جو مالک کی روزی اور اپنے چارے کے چار تنکوں کے لیے دن بھر تانگہ کھینچنے پر مجبور ہو ———

مرحوم بائیسکل اسی طرح چلاتے جیسے کوئی بیمار گھوڑا ہانپتا ہوا تانگہ گھسیٹ رہا ہو۔ نہ جانے وُہ زندگی کے کتنے محاذوں پر لہولہان ہو رہے تھے مگر وُہ زندگی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔ میدانِ جنگ میں کام آ جانے والا سپاہی، ہارا ہوا سپاہی نہیں ہوتا۔ میں نے جس جس طرح کی مادی و ذہنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے انھیں دیکھا ہے، کوئی اور ہوتا تو ماتوں پہلے گھٹنے ٹیک دیتا مگر وُہ برابر لڑے جا رہے تھے، اُن کے ترکش کا سب سے کارگر تیر اُن کی زندہ دلی

اور شگفتہ طبعی تھی۔ وہ صعوبتوں میں مسکرا لیتے اور اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو قہقہوں میں ڈھال لینے کا فن جانتے تھے۔ اُن کی مشکلوں پر دوسروں کے دل لرز اٹھتے مگر اُن کے ماتھے پر میں نے کبھی شکن نہ دیکھی۔ ہر وقت شگفتہ و متبسّم۔ خود ہنستے دوسروں کو ہنساتے۔ گفتگو بھرپور اور دلچسپ ہوتی۔ چہرے پر بکھری ہوئی زردی کے اوپر ہمیشہ مُسکراہٹوں کا ایک چمن کھِلا رہتا۔ مرحوم نے اپنے زخموں کو پھُول بنا لیا تھا

اُنھوں نے زندگی میں اگر کہیں شکست کھائی ہے تو ادب میں، جو اُن کی زندگی تھی۔ حالات و اتفاقات نے فن کار کو اہل کار بنا دیا تھا۔ اُن کے مشاغل میں دُور دُور تک افسانہ نگار کا سُراغ نہ ملتا تھا ——— آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا ——— لکھنا پڑھنا موقوف کر رکھا تھا۔ میں ترغیب بھی دلاتا تو آمادہ نہ ہوتے کہتے "بھائی صاحب ادب میں کیا رکھا ہے، نہ جانے کتنے مسودات نامطبوعہ پڑے ہیں"

ایک مرتبہ حفیظ صاحب نے بہت جھنجھوڑا تو تاؤ میں آگئے، ایک ناول شروع کر دی اور چند مہینوں میں سات آٹھ سو صفحات لکھ ڈالے۔ لیکن اس کے باوجود ادیب کے اندر وہ جو لکھنے کی ایک اُمنگ ہوتی ہے، زندگی کی طرف جو اس کا ایک

اینار، یہ ہوتا ہے وہ بات کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک اُن کی زندگی میں سے نکل چکی تھی۔ افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی اپنی موت سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ کسی دن ادب کی ایسی ہی کلبلی اٹھتی تو بائیسکل اٹھاتے اور مولانا شاہد احمد یا مولانا رزاق الخیری سے مل آتے یا بیٹھے بیٹھے مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اُردو کی "اندرونی سیاسیات" کی باتیں کرتے رہتے جن سے نہ معلوم کیوں انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ ہمیں جب کوئی موضوعِ گفتگو نہ سوجھتا تو انجمن اُردو کا ذکر چھیڑ دیتے۔

"تو ڈاکٹر صاحب آج کل مولانا عبدالحق کن لوگوں کے قبضہ میں ہیں؟"

بس پھر ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد سے چل کر یہ سمجھیے کہ گویا پا پیادہ دہلی سے ہوتے ہواتے کراچی پہنچتے۔ انھیں مولانا عبدالحق کی مروّت و شرافت اور مختلف ادوار میں اُن کے ہم نشینوں کے خبث و ذلت کے سینکڑوں مزیدار سے مزیدار واقعات یاد تھے۔ زبان پر اُن کو بڑا قابو تھا۔ ان واقعات کو ایک چسکہ کے ساتھ پہروں سُناتے چلے جاتے۔

لوگوں سے شناسائی پیدا کرنے میں مرحوم بڑے تیز تھے۔ راہ چلتے ہوئے بس یا ٹرام میں بیٹھے ہوئے، اجنبی لوگوں سے خاصی رسم و راہ پیدا کر لیتے۔

ٹیلی فون کرتے ہوئے کوئی غلط نمبر مل جاتا تو اکثر و بیشتر اس اتفاقیہ تقریب کو باقاعدہ تعارف کی تقریب بنا لیتے۔ کمال یہ تھا کہ لوگوں کو پھر یاد بھی رکھتے۔ البتہ گہری دوستیاں پیدا کرنے کی اب انھیں فرصت تھی نہ ہمت۔ تاہم جس کسی سے اخلاص و مودت کا رشتہ قائم ہو جاتا، دیدہ و دل اُس کے سامنے فرش کر دیتے۔ پُرانے تعلقات کے رکھ رکھاؤ، احترام اور وضع داری میں اپنی مجبوریوں، معذوریوں کو یکسر بھول جاتے۔ ایک مرتبہ کراچی سے دو ہی سائیکل پر، واپس آکر کہنے لگے :

"بھائی صاحب کل شام کا کھانا ہمارے ہاں کھائیے گا"۔

"خیریت تو ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کو جو اُن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے، کھانے پر مدعو کر آئے ہیں۔ یہی نہیں، اُن کے ساتھ پندرہ بیس اصحاب کو بھی، جو اس وقت جنابِ شاعر کی دربارداری میں معروف تھے۔ فرمایا ـــــــ مجھے معلوم ہے اس ایک دعوت کا لایا ہوا قحط مہینوں اب میرے گھر میں رہے گا۔ مگر بھائی صاحب مدت کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی ہے ملنے چلا گیا تھا تو اب کیا کرتا ـــــــ اُن سے کیا کہتا؟"

یہ ناممکن تھا کہ آدمی اُن کے قریب رہے اور ان کے اخلاص اُن کے انکسار، انسانی ہمدردی اور تعلقات میں اُن کی گرمجوشی سے متاثر نہ ہوئے پائے۔ وہ جس کسی کے قریب آنا چاہتے تھے انتہائی کشادگی و خودسپردگی کے ساتھ اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیتے تھے۔ اُن کی شخصیت شہد اور موم کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے دو سالوں میں کبھی ایک سنگریزے کی کسک بھی اُن میں محسوس نہیں کی۔

ہم ۱۹۵۳ء میں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ اس درمیان میں مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وہ کچھ عرصے وزارتِ دفاع میں کلرکی کرتے رہے پھر بے کار ہو گئے۔ پھر ایک خط سے معلوم ہوا کہ ایک انگریزی روزنامے میں سب ایڈیٹر ہو گئے ہیں مگر دوسرے ہی خط سے پتہ چلا کہ پھر بے کار گھوم رہے ہیں۔ آخر آخر میں حالات درہ براہ ہونے لگے تھے۔ حفیظ صاحب اتنے میں پھر ایک نئے محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہو چکے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا سیکریٹری بنا لیا تھا، اور اپنے محکمے میں کسی ذمہ دار عہدے پر اُن کی تقرری کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ میرے لیے یہ خبر بڑی خوش آئند تھی۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو کسی صورت میں بھی وہیں پہنچ جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب

ہر خط میں نئی زندگی کے بڑے ارمان انگیز نقشے کھینچ رہے تھے۔ اُن کا آخری خط مجھے اٹھارہ یا اُنیس جون ۵۵ء کو ملا۔ اُمید کی روشنی سے بھرا ہوا خط تھا۔ پرانے ناول کی اشاعت کے سلسلے میں یہ خوشخبری دی تھی کہ لاہور کے ایک ممتاز ناشر سے معاملہ ہو رہا ہے اور یہ بشارت بھی کہ ایک نئی ناول کی طرح پڑ چکی ہے۔ میں دل ہی دل میں دوست کی بحالی و آبادی پر خوش ہو رہا تھا کہ ناگاہ تیسرے یا چوتھے روز اخبار میں یہ وحشت ناک خبر دیکھی کہ ڈاکٹر اعظم کریوی قتل کر دیے گئے ہیں۔ میں تو اک دم سناٹے میں آکر رہ گیا۔ ڈاکٹر اعظم کریوی قتل کر دیے گئے؟ —— نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کون شقی القلب ہو گا جو ڈاکٹر اعظم کو قتل کر دے؟ سانحہ کی صحت کا کسی صورت سے یقین نہ آتا۔ اُن کی موت کی ہزاروں دوسری صورتیں ذہن میں آتی تھیں لیکن ان کے قتل ہونے کو دل نہ مانتا تھا۔

کراچی میں حفیظ صاحب سے پوچھ بھیجا تو انھوں نے بھی تصدیق میں لکھ دیا "ہاں سچ ہے، کاش غلط ہوتا" —— اتنے میں اخباروں میں تھوڑی سی اور تفصیل آئی۔ لکھا تھا کہ ایک بائیسکل بھی مرحوم کی نعش کے قریب پائی گئی ہے یقیناً یہ وہی سائیکل ہو گی۔ میسر ہو تو میں اس کو قومی نوادرات کی کسی گیلری میں

محفوظ کر دوں اور اس کے ہنڈل کے ساتھ یہ کتبہ لٹکا دوں،

"یہ عظیم افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کی بائیسکل ہے

جو اپنے پیچھے کئی یتیم بچے، کئی غیر مطبوعہ مسودات،

ایک فراموش گار قوم اور یہ بائیسکل چھوڑ گئے ہیں"

○

سنگاپور کا میجر حسرت

دُوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب اتحادی افواج فوجیں ملایا کے ساحل پر اُتریں تو مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ہراول دستوں میں شامل تھے۔ آپ دو سال سے کچھ اُوپر سنگاپور میں مقیم رہے۔

مولانا حسرت جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ تھے اور ہیڈکوارٹر سے شائع ہونے والے ہندوستانی عسکری اخبارات کی ادارت و نگرانی کا فریضہ اُن کے سپرد تھا۔

ہم دونوں (مسعود و ضمیر) ان کے نائب و معاون کی حیثیت میں اس شعبہ سے متعلق تھے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر بڑا فخر ہے کہ ہمیں اپنے زمانے کے ایک صاحبِ طرز انشاپرداز، ایک بڑے صحافی اور ایک بہت بڑے انسان کو بہت قریب اور بڑی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جو لوگ اجنبی سرزمینوں میں فاتح لشکروں کی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں حسرت صاحب سے کتنا اور کیسا تقرب حاصل رہا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کسی چہرے پر کوئی نقاب باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہمارے رفقاء کار میں سے کیپٹن (اب لفٹیننٹ کرنل) جاوید خٹک۔ کیپٹن (اب کمانڈر) حسن عسکری جو ادبی دنیا میں ابنِ سعید کے نام سے مشہور ہیں میجر احمد علی خاں جو آج کل برطانیہ میں پاکستان کے معتمدِ تجارت ہیں، کیپٹن انعام غنی، اور کیپٹن (اب لفٹیننٹ کرنل) رشید حیات پاکستان کے حصے میں آئے ہیں۔ یہ سب دوست وہاں "توم" کے نام سے یاد کیے جاتے تھے اور حسرت اس

"قوم" کے "مرشد" تھے۔ پھر آ گئے "قوم" کے بھی اندر مسعود اور ضمیر کو مرشد کا خصوصی قرب حاصل تھا۔ مسعود دفتر میں اُن کا نمبر ۲ تھا اور ضمیر دفتر سے باہر اُن کا ایڈی کانگ!

اس مطالعے سے اُسی دور کے حسرت کا تذکرہ مقصود ہے چند جھلکیاں، چند باتیں، چند یادیں!

ہمارے لکھنے کا طریق کار یہ رہا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں —— قربتوں اور فاصلوں کے مطابق، کچھ حصہ مسعود نے لکھا ہے اور کچھ ضمیر نے۔ مولانا جہاں ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلے گئے ہیں، ایک نے قلم روک کر مضمون بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مولانا کو دوسرے کے سپرد کر دیا ہے۔

مولانا حسرت کی بے وقت موت ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ یہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت ایک ادارے کی موت ہے۔ ہم نیاز مندوں کے لیے اُن کی موت ایک گہرے ذاتی زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی کے ساتھ دو قدم چل کر بچھڑ جانے پر قلق ہوتا ہے۔ یہ تو اُس دوست کا بچھڑنا

ہے جس کے ساتھ ہم کامل دو برس تک ایک دفتر ہی نہیں، ایک گھر میں بھی رہے ——— یہ تو اس مرشد کی رخصت کا دائمی گھاؤ ہے جس کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے قلم پکڑنا سیکھا ہے ——— یہ تو اس انجمن کے اُجڑ جانے کا ماتم ہے کہ جس کی روشنی ہی کے سبب آج ہم اپنی زندگی کو ایک غیر معمولی متاع سمجھتے ہیں۔ یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن اس مضمون میں تحریر کے انداز کو ہم نے عمداً ہلکا پھلکا رکھا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ روتے بسورتے لہجہ میں مولانا کی شخصیت سے انصاف کرنا تو کجا، اُن کو چھُو سکنا بھی ناممکن ہے۔ ہم نے مرشد کے تذکرے کے لیے وہی اسلوب چنا ہے جو خود اُن کا اسلوبِ حیات تھا۔ ہم حسرت صاحب کی پسند و ناپسند سے واقف ہیں۔ ہم اپنے مرشد کو جانتے ہیں

(م - ع س)

لیجئے اب ضمیمہ سے سنیئے:

مرشد مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔ جاوید کے ہمراہ جس وقت میں

ہالینڈ پارک کے ایک وسیع، دلکشا بنگلے کے اندر پہنچا تو مرشد —— تو مم کے دل میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں "شیرازہ" کے زمانے سے اُنکا نیازمند تھا۔ دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر لنچ کی اسی ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔

"خوب پہنچے ہو میرے بھائی۔ آج رات ظہیر کی سالگرہ کی دعوت ہے مولانا آج ہمیں ایک گاگہ پڑھنے والے شاعر کی سخت ضرورت تھی۔ سبحان اللہ لاہور کا بکھرا ہوا شیرازہ، کہاں آ کر جمع ہو رہا ہے —— نوجوانوں پر یہ رٹن کی مچھلی بچا کر کھاؤ۔ یہاں تو یہی کچھ مُردار کھانے کو ملے گا میاں! وہ تمھاری پونیینسٹ قسم کی روٹی یہاں کہاں ؟"

اب حاضرین سے تعارف شروع ہوا:

"وہ جناب العلم قاضی ہیں۔ تم ان کا نام غالباً پہلی مرتبہ سن رہے ہو مگر مشہور ادیب ہیں —— وہ دھان پان صاحبزادے مولانا عسکری ہیں۔ جاتو کی رائے میں اپنے نامور والد میرزا محمد سعید دہلوی سے بھی بڑے ادیب ہیں —— یہ رشید حیات ہیں، بس رشید حیات، محض و خالص۔ جاوید سے بھی مل چکے ہو۔ آپ حلم اور ظلم سے ہو کر علم کے کوچے میں وارد ہوئے

ہیں ---- اور حضرات یہ مولانا ضمیر جعفری ہیں۔ جہلم کے رجنبہ والے اجہاں کے لوگ خدا کے تصور کے لیے تھانے وار کو دیکھتے ہیں "

پھر اُس شام ظہیر کی سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظہیر سے اُن کی بے اندازہ محبت کی پہلی جھلک تھی جو ہم نے دیکھی۔ مرشد نے جزیرے کے تقریباً سبھی انڈین افسروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ وہ چار خوش ذوق انگریز جوڑے بھی موجود تھے۔ محفل جمی ---- تو مرشد میزبان کے بجائے کچھ اس طرح مہمان سے بنے بیٹھے رہے جیسے انھیں اپنے سگرٹ کے علاوہ کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو ---- مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد ---- مگر جب پھر بوتلوں کے کاگ اُٹھنے لگے تو مرشد نے چہکنا شروع کیا اور اب جو منظر یاد آ رہا ہے تو پوری انجمن گویا تنہا حسرت کی ذات سے عبارت تھی۔ میجر احمد علی خاں کے الفاظ میں حسرت کا چراغ روشن ہو گیا۔ اُن کے ہونٹوں سے شعر و ادب، تاریخ و تصوف، طنز و ظرافت، زندگی اور اس کی چاندنی کا ایک رنگ آبشار جاری تھا ---- تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

یہ محفل، جو مرشد کی اصطلاح میں "بزمِ ہاؤ و ہو" کہلاتی تھی، اگلی صبح کے کوئی تین بجے تک قائم رہی۔ یوں کہنا چاہیے کہ مرشد اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ

قائم رہے ورنہ تین چوتھائی محفل وہیں کرسیوں پر پاؤں پسار کر سو گئی تھی۔ مرشد تو وہیں کھڑے کھڑے "صبوحی" تک لگا دینے کا حوصلہ و ارادہ رکھتے تھے مگر یہ معلوم شاید ذخیرہ ختم ہو گیا تھا یا شاید جس کسی میں ابھی تک دوسرے کو تھامنے پکڑنے کی سکت باقی تھی وہ ان کو تھام پکڑ کر خوابگاہ میں لے گیا اور یہ محفل بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ اس کو جمتے تو سب نے دیکھا تھا مگر برخاست ہوتے شاید ہی کسی نے دیکھا۔ نسبتاً ہوش مند لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر کل صبح اٹھیں لوگوں نے دفتر لگانا ہے تو یہ دفتر لگ چکا۔ مرشد کی نسبت سب کو قطعی یقین تھا کہ وہ کل کیا معنی، اب ایک پورے ہفتے کے لیے گویا معطل ہو گئے مگر پھر دوسری صبح کو جو پہلی آواز ہالینڈ پارک کے خوبصورت گنبدوں اور روشن غلام گردشوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی وہ مرشد کی آواز تھی۔

"جاگو یارو، عسکری، ضمیر ـــــ قاضی صاحب"

"ارے او ساون کے بادلو!"

"ابے او خبیثو!"

اور بھاگم بھاگ ہم لوگ جب تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچے تو وہ پپیتے کے آخری ٹکڑے کو کانٹے کی نوک پر چڑھا کر خود دفتر جانے کے لیے تیار کھڑے

تھے جہاں سہ پہر تک اب انھیں مسعود کے قبضے میں رہنا تھا۔ لہٰذا یہ روداد مسعود ہی سے سنیئے :

مجھے دفتر میں اُن کا نمبر ۲ ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس سے پہلے میں کلکتہ میں اُن کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ مرشد میرے لیے کوئی نئے ' باس ' نہ تھے۔ سنگاپور پہنچا تو پہلے ہی روز مجھے پورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا :

"مولانا آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب یہ کام سنبھالیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں۔ مجھے اب آرام کرنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے۔ کچھ گھوم پھر لوں۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کروں گا۔"

اس تمام وقفہ میں سگریٹ منہ سے نہیں نکلی۔ دھواں آنکھوں میں جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں جا نہیں رہا، آنکھوں سے آ رہا ہے۔ درمیان میں جھنجلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے۔ لیکن آنکھوں کی جلن اور سگریٹ کے دھوئیں میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے تھے۔ علل و معلول کی اکثر کارفرمائیوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیاز ہی رہے۔

"ہاں تو مولانا مسعود صاحب بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ——— وہ بھی چائے اور یہ سگریٹ ——— جا وید ماچس ——— سنگاپور کو آپ کلکتہ سے

زیادہ تقویٰ شکن پائیں گے۔"

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بو سی آئی۔ میں نے کہا — "مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟" — بولے — "آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہو گا۔ آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں" — پھر ذرا چلا کر بولے — "ارے قاضی صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھئے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بُو سی کیا آ رہی ہے؟" — "اس کہیں سے بُو" کا راز یہ کھلا کہ جناب کی پتلون کا پائنچا چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے — "مولانا یہ سگریٹ بھی بڑی واہیات چیز ہے، سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ ہی دوں" — اور شام تک سگریٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی۔

مُرشد کی باتیں کرتے ہوئے تسلسل یا اسلوب کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے خود انھوں نے زندگی کو اسلوب کی بندشوں میں کبھی قید نہ ہونے دیا۔ فوج کے سخت گیر ضوابط بھی انھیں کبھی پابند نہ کر سکے۔ ایک مرتبہ جب افسرِ اعلیٰ نے کسی بات پر باز پُرس کی تو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:۔

جرمنی ختم اور اُس کے ساتھ جاپانی بھی ختم | تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتے کی بات ہے ایک روز دفتر چلے آ رہے ہیں۔ اس شان سے کہ منہ میں سگرٹ ہے۔ فیلڈ سروس ٹوپی بغل میں دبی ہوئی ہے اور کندھوں پر ایک طرف تین ستار لگے ہیں اور دوسری طرف دو۔

میرے وہاں پہنچنے پر مرشد نے مطالعہ کی اک ذرا سی فرصت اور سیر و سیاحت کی اک تھوڑی سی مہلت کے عوض اپنے تمام فرائض مجھے تفویض کر دینے کا فرمان تو جاری کر دیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مطالعہ کے لیے مرشد کو مہلت کی ضرورت ہی نہ تھی جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں اس طرح ہم نے انھیں پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اٹھائی، اُسے چھوا، ٹٹولا، سُونگھا، چند ایک ورق اُلٹے پلٹے، کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفسِ مضمون، کتاب کی رُوح، سب کی سب، اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے۔ دُوسرے روز آپ اس کتاب کے متعلق بات کریں تو وہ اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اُٹھان، اس کی کمزوریاں اور خوبیاں، مصنف کا سٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اُس کی جزئیات کا موازنہ، یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب اُنھوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو۔

رہی سیر و سیاحت کی فرصت، تو یہ بھی ایک طرح کی آرزو ہی تھی جسے عملی رنگ دینے کا ارادہ مرشد نے غالباً کبھی کیا ہی نہ تھا۔ سچ مچ کی سیر و سیاحت مرشد کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ پھر سیر کے لیے انھیں طویل طویل راستے ناپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حسن اُن کے لیے ایک داخلی کیفیت تھی۔ حسن اُن کی آنکھوں اور اُن کے دِل میں تھا۔ خارجی اسباب کا سہارا اگر انھیں درکار تھا تو نہایت ٹھیک سا میس کی ایک کھڑکی سے جھالکو تو چھالیہ کے کنتیدہ قامت پیڑوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دوسری طرف بالکنی کے باہر چینی چیری کا ایک تناور درخت باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پُشت کو اٹھتی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلہ تھا جس کے زمرّدیں لان اُوپر سے لڑھکتے، پھسلتے ہمارے میس کے حاشیے پر آ کے کہیں رُکتے تھے۔ فراہٹ کہ ناریل کے پیڑ ایک دُوسرے پر جُھکے ہوئے تھے جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا فسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد فرمایا کرتے۔ ۔ چانسری لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین نہیں کر سکتے اُس گدھے کو سارے سوئٹزرلینڈ میں گھمائیے تو بھی اُس کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مطالعہ و سیاحت کی فرصت کی خاطر دفتر

کاکاروبار میرے حوالے مرشد کی ایک ادا تھی۔ لیکن اس ادا میں تصنع یا تکلف ہرگز نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت اپنی باتوں پر واقعی یقین کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں انھوں نے بالی کے سفر کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی کھینچ رکھا ہو۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ اس روز مرشد کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کے میز پر بھی موجود نہیں تھے۔ کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ کُرتے پاجامے میں لیٹے "سٹوری آف سان مائیکل" میں مستغرق ہیں۔ "سٹوری آف سان مائیکل" مرشد کی تازہ ترین دریافت تھی۔ فرمایا ——— "مولانا اس سے بہتر کتاب میں نے تو آج تک نہیں پڑھی"۔ لیکن بعد میں ہم اس طرح کے غلو کے عادی ہو گئے۔ مرشد کا انداز ہی یہ تھا۔ اُن کے مطالعہ کی کتابیں منتخب تو ہوتی ہی تھیں، بس جو کتاب شروع کرتے۔ اُس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے۔ "سٹوری آف سان مائیکل" سے پہلے ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" دنیا کی بہترین کتاب تھی اور اُس سے پہلے ہکسلے کی "ایلس اِن غازہ"۔

ہم نے پوچھا "آپ دفتر میں تو نہیں تشریف لے جائیں گے"———

بولے ——— "مولانا مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیں۔ میں چاہتا ہوں۔۔۔

مگر ہاں دیکھئے کوئی دس بجے کے قریب جیپ بھیج دیجئے گا۔ ذرا رافلز لائبریری کا چکر لگا آؤں گا۔ . . . ممکن ہے تھوڑی دیر کو دفتر میں بھی آ نکلوں!"

ہمارا دفتر سیسل اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ سیسل اسٹریٹ کو سنگاپور کی فلیٹ اسٹریٹ کہہ لیجئے۔ اس زمانے میں سنگاپور کے تمام انگریزی اور ملائی روزنامے وہیں سے نکلتے تھے۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہ جنگ سے پہلے ایک ڈچ تجارتی کمپنی کا دفتر تھا جو ملایا سے ربڑ اور مسالے برآمد، اور ڈنمارک سے بیئر درآمد کرتی تھی۔ دفتر کیا تھا ایک وسیع ہال تھا جو کسی زمانے میں پارٹیشنوں سے مزین ہو گا مگر جاپانیوں کے چار سالہ تسلط میں ان تکلفات کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ جاپانی جس عمارت میں ایک مرتبہ بسیرا کر گئے اس کے دروازے، کھڑکیاں تک غائب ہو جاتیں ساگوان کی بیش بہا الماریوں کو توڑ کر چاول اُبالنے کے لیے چولھا سلگا لینا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ الغرض ہمارا دفتر بالکل ننگ دھڑنگ قسم کا دفتر تھا۔ جس کے چوبی فرش بھاری بھرکم فوجی بوٹ ہر وقت ایک زلزلہ بپا کیے رکھتے تھے۔ ابھی دس بج کر کچھ منٹ ہی گئے تھے کہ اس زلزلے کی

لہجہ اور گرج میں ایک نئی شدت پیدا ہو گئی اور ہم سمجھ گئے کہ مرشد تشریف لے آئے۔ موٹی موٹی کتابوں کا ایک "دو بغل بھر پلندہ" ریک میں پھینکا، ٹوپی اتاری سگریٹ منہ میں اڑسی اور ماچس کھنکھناتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ مرشد اخبار سے جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مرشد کی نظر میں ہم سب جاہل تھے۔ کوئی ذرا کم، کوئی قدرے زیادہ۔ اخبار وہ بالکل ہمارے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ چنانچہ آتے ہی جائزہ شروع ہو جاتا:

"مولانا لائیے تو ادھر، یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں ——— مولانا یہ کوئی سرخی تو نہ ہوئی۔ ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ خبر کی سرخی میں پہلی سطر جملہ فعلیہ خبریہ ہونا چاہیئے ——— آپ کو شاید ان سے تعارف نہ ہو لیکن مولانا مبتدا اور خبر، مضاف اور مضاف الیہ میں ایک بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے ——— اور ——— بھئی محرم علی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ ہر صبح کاتبوں کے قلم ضرور دیکھ لیا کریں۔ کل کی سرخیاں تو ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں ——— حمید صاحب "نون" کا دائرہ بنانے کی مشق اگر آپ نے لگ کے چار پانچ برس کر لی تو آپ "نون" بنا لیا کریں گے۔ فی الحال تو آپ کا نون فیروز خاں نون کا

"نون" معلوم ہوتا ہے۔"

تعریف کے معاملے میں مرشد شقاوت کی حد تک سخت تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ وُہ دوسروں کو ناپتے جانچتے وقت شاید نادانستہ دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ موازنہ اُن سے ہو تو تعریف کے قابل کون نکلے؟ —— پھر انھیں یہ خیال بھی تھا کہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے آج کل کے نوجوانوں کی برخود غلطی پہلے ہی تشویش ناک صورت اختیار کر چکی ہے انھوں نے تعریف کر دی تو مبادا دماغ بھی خراب ہو جائے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا دور آگیا ہے کہ لوگ قواعد کے ابتدائی اصول جانے بغیر، عربی و فارسی کی تحصیل کے بغیر، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر، شعر کی تہذیب اور اُس کا مزاج سمجھے بغیر، مصنّف اور شاعر بن بیٹھتے ہیں۔ دوست علمنہ میں ایک افسانہ چھپ گیا، چلو افسانہ نگار بن گئے۔ "بھلجھڑی" نے ایک غزل شائع کر دی، لیجیے شاعر ہو گئے۔ پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کیے، جہالت کے حصاروں میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی مزاحیہ کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ پہلے روز کالم مرشد کو دکھایا۔ کالم پر نگاہ جماتے سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے گئے۔ پڑھ چکے تو سگرٹ

کے کش پیچوں پیچ ایک نجم سی — "ہونہہ" — کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکائے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ دوسرے روز پوچھتے ہیں — "مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا، آج کے اخبار میں تو نہیں ہے" میں نے عرض کیا — "پھاڑ کر پھینک دیا تھا" — فرمایا — "دے دیتے کیا ہرج تھا۔ اور لغویات بھی تو چھپتی رہتی ہیں" — مرشد کی زبان سے یہ بھی گویا حوصلہ افزائی کے کلمات تھے۔ اس کے بعد کبھی کبھار میں کالم لکھ کر مرشد کے پاس لے جاتا اور اُن سے — "ہونہہ" — وصول ہو جاتی ہو کالم کی اشاعت کی اجازت بھی ہوتی۔

ایک روز تو اُنھوں نے تعریف کی حد ہی کر دی۔ ارشاد ہوا — مولانا اگر آپ محنت کریں تو ممکن ہے ایک روز آپ کو کالم لکھنا آ جائے۔ آپ کو یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے کہ آپ ان پڑھ ہیں اس لیے آپ فلاں یا فلاں کے اسلوب نقل کرنے کے بجائے خود اپنی سیدھی سادی زبان میں بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ تحریر کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔ نگارش کی اپنی طرز اسی سے بنتی اور نکھرتی ہے" — ان دو جملوں کے علاوہ مرشد کے منہ سے کبھی اور کوئی توصیفی کلمہ سننا نصیب نہ ہوا، اگرچہ پسِ پشت وہ اپنے شاگردوں کی تھوڑی بہت تعریف

کر دیا کرتے تھے۔

مرشد کے ساتھ کام کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوبِ طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تر و تازہ رکھتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہو جائیں یا کھل کر شاباش دے جائیں۔ معیار کے معاملہ میں وہ قدم قدم پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا جالب اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے۔ ضمیر کی رائے تھی کہ اگر خود مولانا آزاد، مولانا جالب اور نواب خیال بھی اُن کے سٹاف میں ہوتے تو اُن کا مرتب کیا ہوا اخبار مرشد کے معیار پر شاید ہی پورا اُترتا۔ مرشد کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عجیب سی گھٹن طاری رہتی تھی مگر اُن کے جانے کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس گھٹن سے ہم نے کتنا کچھ سیکھا اور اُن کی نظر اپنے پیشے میں ہمارے قد و قامت کو کتنا اُونچا لے گئی تھی۔ علم و فن پر اُن کا اپنا انداز طالب علمانہ تھا۔ اپنے آپ کو انھوں نے کبھی فارغ التحصیل نہیں سمجھا۔ وہ ہمیشہ، ہر وقت، علم کے اکتساب میں مصروف رہے۔ کہا کرتے، "اخبار نویسی کرتے پچیس برس ہو گئے ہیں لیکن یہاں فوج میں آ کر اور پبلک ریلیشنز کے اپنے ساتھی انگریز صحافیوں کے کام کو دیکھ کر صحافت کے کئی گُر اب سمجھ میں آئے ہیں" ——— فرینک اوون کے آپ بڑے مداح

تھے۔ فرینک اون اُن دنوں برطانوی فوجوں کے اخبار "سی آگ" کا ایڈیٹر یعنی اُمدیریوں کا چراغ حسن حسرت تھا۔ آج کل وہ غالباً برطانیہ کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ڈیلی میل کا ایڈیٹر ہے۔

سنگاپور میں "ذوالفکیر" کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفقیر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں "ذوالفکیر" — عبدالفقیر ہی کا مخفف تھا یا ذوالفقار کی مالاباری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دکان پہ گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر وہاں ضرور رک جاتے۔ سنگاپور کی مرطوب آب و ہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دکان میں کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھیچے چلے جا رہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کے اندر جا کر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب سے تانک جھانک ہو رہی ہے۔ اِدھر ہم دروازے پر کھڑے ہیں یا جیپ میں بیٹھے انھیں کوس رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم انھیں اُتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپس بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دکھ ہوتا۔ اس لیے نہیں کہ ہم نے اُن کا انتظار

کیوں نہ کیا، اس لیے کہ اُن کے ساتھ اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے باوجود ہم اتنے کورذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بہ منزل رکھی ہیں مگر ہم میس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ میس کے بجائے "ویلنگر" یا کتابوں کی کسی دوسری دُکان میں بستر لگا لیتے۔

دفتر سے مرشد کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے۔ ویسے ارادہ اُنھوں نے کئی مرتبہ کیا۔ بعض اوقات محض اس خیال سے کہ یونٹ کا افسر کمانڈنگ ہونے کی وجہ سے اُن میں اور دوسروں میں آخر فرق ہی کیا ہوا؟ اُن سے آخر کون سوال کر سکے گا کہ آپ دفتر کیوں نہیں آئے؟ مگر پھر دفتر کے بغیر جی بھی نہ لگتا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد ٹیلی فون آجاتا کہ جیپ بھیج دو۔ دفتر آئے اور کوئی چیز لکھنے بیٹھ گئے۔ ایک دفعہ اُردو کے شاعروں کے تذکرے کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا اور کسی کتاب یا حوالہ کی مدد لیے بغیر بیسیوں شعرا لکھتا لیے جن شاعروں کا ہم میں سے کسی کو نام بھی یاد نہ تھا، اُن کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات ہی نہیں، بلکہ ان تاریخوں میں اختلافات کی بحث، اُن کے کلام کی خصوصیات اور چیدہ چیدہ اشعار یُوں قلم بند کرتے جاتے جیسے کہیں سے نقل کر رہے ہوں۔

قلم اور زبان پر مرشد کا جتنا زور چلتا تھا زندگی کے دوسرے مسائل اتنے ہی اُن کے قابو سے باہر تھے۔ کسی ارادے کی تکمیل اُن سے نہیں ہو سکتی ویسے جناب کے ارادے بھی ناقابلِ عمل ہوتے۔ مثلاً وہی بالی کے سفر کا ارادہ لیجئے۔ جس کی طرف سرسری سا اشارہ اُوپر آچکا ہے۔ اُس زمانے میں بالی کا سفر اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ پک نک پر راولپنڈی سے واہ تک چلے جانا ہے۔ ایئر فورس کے ہوائی جہاز چاروں طرف بھاگے پھرتے تھے اور پبلک ریلیشنز کا نام ہر سفر کے لیے کھل سم سم کے معنی رکھتا تھا۔ لیکن مرشد بھلا عوام الناس کی طرح سفر کیوں کرتے؟ مرشد کے بالی کے سفر کا تصور یہ تھا کہ ضمیر اُن کے ساتھ ہو۔ کچھ پیدل، کچھ اِکّوں پر اور کچھ ٹٹوؤں پر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچیں۔ کھانے کا وقت جہاں آجائے پڑاؤ کر کے وہیں چولھا روشن کیا جائے۔ ایک آدمی لکڑیاں چن رہا ہو، دوسرا دیگچی مانجھ رہا ہو اور پگڈنڈی کے کنارے مُرغی بھونی جا رہی ہو —— اس طرح کا ایک اور شاعرانہ ارادہ اُن کا یہ تھا کہ سنگاپور سے دو چار میل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ وہ ٹھیکے پر لے لیں اور باقی زندگی وہاں مطالعہ و تصنیف میں گذار دیں۔ گھنٹوں اس سکیم کا ذکر اذکار رہتا۔ ایک دفعہ میں نے نہایت ہی غیر شاعرانہ سوال کر دیا کہ اس

غیر آباد جزیرے سے بسر اوقات کی کیا صورت ہو گی۔ فرمایا ——— "بھئی یہ جزیرے تو اللہ تعالیٰ نے جنّت کے نمونے پر بنائے ہیں کہ فکرِ روزگار کا یہاں گذر تک نہیں ہے۔ اس مٹی میں آپ دھان کی مٹھی اُٹھا کر پھینک دیں اور دوسرے مہینے فصل لپیٹ لیں۔ کھانے کے لیے مرغیاں پالیے۔ پھر ناریل ہیں کہ آپ کے لیے اکل و شرب کے قاب سر پر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ صبح صبح ایک کشتی میں بیٹھ گئے اور کچھ تازہ بہ تازہ نو بہ نو مچھلی پکڑ لائے تو لا محالہ انسان کو اور کیا چاہیئے ؟" ——— مرشد دراصل اپنی ذات میں ایک وضع اور ایک تہذیب کے سیمبل تھے۔ لوگ کہتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، اُن کا جسدِ فانی ختم ہو گیا مگر اُن کا نام کبھی ختم نہ ہو گا۔ ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہمیں اس میں تسلّی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔ حسرت کا نام زندہ رہ سکتا ہے مگر ہم جانتے ہیں ہمارا مرشد اب یہاں نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی ادب و فن اور تہذیب و وضع داری کا ایک پورا دورِ تاریخ کے ایک موڑ کے اُدھر اوجھل ہو گیا ہے مکتب ہی نہ رہے تو اب کون ہو گا جو گھنٹوں اس تحقیق میں لگا رہے کہ جُوں جُوں کے بعد تُوں تُوں کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے۔ آج کسی لکھنے والے

کی تحریر میں محاورے یا گریمر کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے تو جواب یہ ملتا ہے کہ جناب میں تو اس کو اسی طرح درست سمجھتا ہوں۔ مرشد ذرا سے اشتباہ پر سند کے لیے پریشان ہو جاتے تھے ——— "مسالک صاحب فلاں محاورے کے متعلق کچھ اُلجھن سی لاحق ہو رہی ہے۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ منشی دیا شنکر نسیم، نے اس محاورے کو اس طرح باندھا ہے مگر اب وہ مقام ذہن سے اُتر گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں تو کوئی سند ہوگی؟" ——— لیکن میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا، آئیے پھر سنگاپور کی طرف!

دفتر میں مولانا کے چہرے پر مسلسل خشونت سی طاری رہتی تھی جس کی وجہ سے دفتر کے اوقات میں اُن سے کھل کر بات کرنے کی جرأت کوئی نہ کرتا۔ اس وقت وہ حسرت صاحب بلکہ بعض اوقات "سر" تک ہو جاتے تھے لیکن دفتر سے اُٹھتے ہی سب حجابات اُٹھ جاتے اور وہ حسرت صاحب سے اُتر کر مرشد، ہو جاتے۔ جیپ کی اگلی نشست میں جناب پھیل جاتے اور پچھلی نشست میں جاوید، انعام قاضی، ضمیر اور میں۔ اب فقرے پر فقرہ چست ہو رہا ہے، بات میں سے بات نکل رہی ہے۔ راستے میں اس بے تکلفی سے بولتے کہ سنگاپور کے ٹریفک کے تمام شور و غل کے باوجود پیدل پٹری پر چلتے ہوئے راہگیر اُن کی بات

سُن سکتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی واقف کار نے کوئی ایسا انکشاف کر دیا جس پر غصہ، ندامت، تعجب یا کوئی اور مناسب ردِ عمل جو ہوتا وہ تو ہوتا ہی تھا، سب سے زیادہ کوفت اس بات پر ہوتی تھی کہ "ہوم" کا یہ قصہ باہر کیسے پہنچ گیا۔ بعد میں پتہ چلتا —— "ارے بھئی کل جب تمہاری جیب کتر دی تھی۔ میں برابر کے روم پر "کون داد" میں کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا کہ حضرت صاحب کی آواز نے چونکا دیا اور پھر جو کچھ وہ فرما رہے تھے اس نے اور بھی —— الغرض دفتر سے باہر قدم رکھتے ہی مُرشد کچھ اور ہو جاتے مگر داستان کا یہ حصہ ضمیر سے سنیئے کہ وہ اس معاملہ میں "ماہر مرشدیات" ہے۔

دفتر میں میرا اُن کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا کچھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا۔ اس "واسطے" سے بس یہ سمجھئے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا۔ مرشد جب آواز دیتے دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر! نہ معلوم کم بخت کونسا محاورہ اُلٹا پڑا ہے؟ کس روزمرے کو تکلیف پہنچ گئی ہے؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا؟ کسی جملے کی نشست و برخاست نہیں ہو گئی؟ کوئی بندھنے والا خیال کھُل تو نہیں گیا؟ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کونسا شاخسانہ اُٹھنے والا ہے؟

ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ تاہم نوجوانوں کی پوری معنوی نسل کو اپنے سامنے تختۂ دار پر کھچتے ہوئے دیکھنے سے ہم کتراتے ضرور تھے۔ ہمیں مرشد کی ڈانٹ سے زیادہ اُن کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے!

میں مرشد کی شاموں اور راتوں کا اردلی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دنوں کی بہ نسبت اپنی شبوں میں کہیں زیادہ زندہ و تابندہ نظر آتے تھے۔ دن کو تو وہ اکثر ایک نہایت واہیات سے خول میں، جس کو انھوں نے اپنی شخصیت کے اوپر منڈھ رکھا تھا، سکڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ بعض اوقات اُن کا رویّہ نہایت روکھی پھیکی سرد مہری سے جا ملتا۔ ہم نے بارہا یہ تماشا دیکھا کہ کوئی ملاقاتی پاس بیٹھا ہے مگر مرشد سگرٹ کا ٹن اُس کے سامنے رکھ کر خود خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ غریب پشیمان ہو کر اُٹھنے لگا تو مرشد جیسے چونک کر بولے

——— "ہوں ——— تشریف رکھیے مولانا، آپ سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں" ——— وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو مرشد پھر غائب۔ دراصل اُن کے اپنے اندر اتنا کچھ تھا کہ باہر دیکھنے کی انھیں فرصت تھی نہ خواہش۔ البتہ شام

کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہو جاتا۔ اُن کی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے سرِ شام بیدار ہوتے۔ غسل کرتے، لباس بدلتے چھٹی کا دن ہوتا تو سہ پہر سے اُٹھتے ہی اُس وقت۔ شیو بھی شام ہی کو بناتے۔ اُن کے لیے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا، سو کر جاگنا اُس سے زیادہ مشکل تھا اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہونا تو گویا قطرے کا گہر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہننے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی کہ لباس خود پہننا بھی پڑے۔ سگرٹ۔ کتاب اور شراب کے علاوہ وہ کسی شے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپروا تھے۔ مگر چونکہ بڑا جرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لیے جو چیز جس طرح پہن لیتے، سج جاتی۔ وہ تیار ہوتے نہیں تھے؛ تیار کر لئے جاتے تھے۔ اُن کا بیٹ مین عنایت اللہ جس کو وہ علّامہ کہتے تھے، بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا ——— "میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں"۔

مرشد تیار ہو کر بیٹھتے تو پوری قوم، اُن کے کمرے میں جمع ہو جاتی۔

جس سے ملحق بڑی اعلیٰ نشست گاہ موجود تھی لیکن وہاں جا کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اگر مرشد کا بس ہوتا تو وہ کھانا بھی اُسی میز پر کھاتے جس پر سمرسٹ ماہم، جیمز جوئیس، عذرا پاونڈ اور بالزاک وغیرہ کے دوش بدوش حجامت کا سامان، عینک اور گھڑی، سگرٹ اور ماچس، قلم اور کاغذ، معدے کے انگریزی چورن، موزے اور چھوٹی موٹی درجنوں دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ یہ "محفلِ نورانیاں" اسی میز کے گرد جمتی۔ مرشد اس وقت اپنے آپ کو خول سے نکال کر گویا میز پر رکھ دیتے۔ اُس وقت اُن کے چہرے کی شگفتگی اور گھنی گنجان مُونچھوں میں سے پھُوٹ کر کان کی لووں تک پھیلتی ہوئی ایک دل آویز مسکراہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ شام ہوئی اور مرشد نے اپنا مخصوص نعرۂ مستانہ بلند کیا:

"ذرا خان صاحب کو آواز دینا"

یہ خان صاحب پوری یونٹ کے کوارٹر ماسٹر تھے جو عملاً مرشد ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بیچارے صبح سے اس آواز کے منتظر ہوتے اور آواز سنتے ہی میز کو کارگہِ شیشہ گراں بنا کر رکھ دیتے۔ مرشد کی "محفلِ شبینہ" کی پہلی مجلس ڈنر تک جاری رہتی اور ڈنر وہ گیارہ بجے سے پہلے شاذ ہی کھاتے تھے۔

یہ محفلِ شبینہ ——— "ذرا خان صاحب کو آواز دینا" ——— سے شروع ہو کر عموماً اُس مقام پر ختم ہوتی جہاں یا تو حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہ سکتی یا لوگ اپنے آپ کو آوازیں دینے لگتے۔ مرشد کو اپنے دَور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر اساتذۂ قدیم کے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وُہ داغ سے شروع ہوتے پھر جُوں جُوں کیف بڑھتا جاتا وُوں توں غالب و بیدل سے ہوتے ہوئے عرفی و نظیری، سعدی و حافظ کی طرف اُوپر ہی اُوپر چڑھتے جاتے۔ دوسروں کے شعر پڑھنے میں انھیں جتنی راحت ہوتی اپنے شعر سنانے میں اتنی ہی وحشت ہوتی۔ ہم اصرار کرتے تو لاحول پڑھ کر ٹال دیتے۔ لیکن محفلِ شبینہ کے آخری رسیلے لمحات میں ہتھیار ڈال دیتے اور پھر ایک نہایت پُرسوز، کھوئے کھوئے، ڈوبتے ابھرتے ترنم کے ساتھ، جس میں ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی تھی، ڈھائی تین تین شعروں کی دو چار غزلیں سُنا دیتے۔ اُن کی مشہور غزل ——— آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں ——— "ہمارا قومی ترانہ" تھی جس کے بعد مرشد حسنِ یار کی باتوں سے آگے نکل کر خود "آستانِ یار کی طرف چل پڑتے۔

"ہاؤ ہُو کی یہ محفلیں، مرشد کے کلاسیکی مذاقِ ادب، اُن کے وسیع

معلومات، دلنشیں ظرافت، شُستہ و برجستہ بذلہ سنجی، اور برمحل اعلیٰ اشعار کے ترشح کے باعث ایک سدا بہار دبستانِ علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں باتوں باتوں میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے باقاعدہ اکتساب سے بھی شاید ہی سیکھ سکتے بحث کے معاملہ میں اُن کا معاملہ یہ تھا کہ ——— اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ——— چنانچہ انھیں چھیڑنے کے لیے ہم کوئی غلط نظریہ، کوئی متنازعہ فی محاورہ، کوئی بھونڈا اسلوبِ بیان، شیر شاہ سوری کا غلط سالِ جلوس، شبلی کے ماخذات، سیماب اکبر آبادی کا کوئی شعر، ——— غرضیکہ کوئی سی بات مصرع طرح بنا کر چھوڑ دیتے اور مرشد مشرق و مغرب کی وسعتیں سمیٹ کر دیکھتے دیکھتے معلومات کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیتے۔ کسی لفظ کی صحت کے درپے ہو گئے تو اُردو فارسی اساتذہ کے یک مُشت پندرہ بیس اشعار گویا ایک دوسرے سے بندھے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں سے وہ خدا معلوم کہاں کہاں سے ایسے ایسے گمنام لیکن جیّد شعرا کو ڈھونڈھ نکالتے جن کو جاننا ادب کو جاننے کے لیے لازمی ہے مگر جانتا کوئی نہیں۔ اُردو شاعری میں وہ حسرت موہانی اور اقبال کے بعد کسی شاعر سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ جن شعرا کا کلام نظر سے گزرتا تھا یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے مرشد

نے اُن کو صرف دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوجھ بوجھ کا شاعرانہ رچاؤ اس ——— کسی لفظ کے حسب نسب کا مسئلہ درپیش ہے تو چراغ لے کر مصر و یونان کے اندھیروں میں اُتر جاتے اور عرب و عجم، افغانستان و کشمیر سے ہوتے ہوئے جب مراجعت فرماتے تو ترکی الاصل، عربی النسل، ایرانی نژاد ——— اور خانہ زاد الفاظ کے الگ الگ جلوس ان کے ہم رکاب ہوتے ——— تاریخ پر عبور کا یہ عالم کہ غیاث الدین بلبن کے رکاب داروں کے نام معہ سنِ ولادت و وفات سُن لیجئے۔ سکندرِ اعظم مقدونیا سے چل کر جن جن راستوں سے ہوتا ہُوا بیاس تک پہنچا تھا، مرشد ان راستوں کے ایک ایک پتھر سے واقف تھے ——— اسلام کے تہذیبی، معاشرتی اثرات پر اُن کی نظر اتنی گہری تھی کہ صدیوں کی دھوپ چھاؤں کے ایک ایک سائے کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دیتے۔ دوسری طرف پرانین، ہندو دیومالا میں بھی بڑی دُور تک پہنچے ہوئے تھے۔ افسانوی دیوی دیوتاؤں کے باہمی رشتوں ناطوں، جھگڑوں آویزشوں سے پورے پورے باخبر، علمِ طب سے اتنا گہرا شغف کہ اگر وہ ادب کے بجائے طب میں جا پڑتے تو شاید زیادہ آسودہ رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ فلسفہ ہو یا فلکیات، بات اس قدر سُلجھا کر بیان کرتے کہ مولانا صلاح الدین احمد

کے الفاظ میں "موضوع کو پانی کر کے چھوڑتے"۔ تاریخ اُن کا خاص مضمون تھا
مرشد جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا، جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔
مرشد موج میں ہوتے تو نکتہ طرازی و انجمن سازی کے لیے کوئی غلط بات
کہنے کی بھی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ اس کیفیت میں وہ صحیح بات کے بھی پرزے
اُڑا دیتے۔ بالخصوص جہاں ذاتی پسند یا رائے کی گنجائش ہوتی۔ مثلاً اگر آپ
گاندھی جی کی عظمت بیان کر رہے ہیں تو مرشد بندوق کی نالی گاندھی جی کی طرف
سیدھی کر دیتے۔ اگر آپ گاندھی جی کی مذمت کر رہے ہیں تو مرشد
اپنے ترکش کے سارے تیر لے کر گاندھی جی کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔
اصلیت، جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، یہ تھی کہ ایک عظیم جنیئس ہونے کی وجہ
سے اُن کی اپنی اَنا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب
ہونے کو تیار نہ تھے۔ چھوٹوں کے سامنے وہ جس عاجزی سے بچھ جاتے تھے
بڑوں کے سامنے اتنے ہی سرکش نظر آتے۔ لیکن پھر چند شخصیتیں ایسی بھی تھیں
جن کے سامنے اُن کی گردن ہر وقت جھکی ہوئی تھی۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام
آزاد کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہ سُن سکتے۔

دوستوں کی محبت اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑی تسکین

تھی مگر دوستی کرنے میں وُہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے۔ مدّت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوست بننے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن اندر ہی اندر نہایت نامعلوم طور پر وُہ دوسرے کے دل میں سما جاتے اور پھر دوستی میں اُن کی بے لبسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جاتا تو وُہ اُسے چھوڑ نہ سکتے۔ عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ سالک صاحب کی سب سے زیادہ عزّت ہی اس لیے کرتے تھے کہ سالک صاحب فن میں اُن کے سب سے بڑے حریف تھے۔ احمد شاہ بخاری، مجید ملک، مولٰنا صلاح الدین، صوفی تبسّم، تاثیر، عابد، فیض، تاج کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور شیفتگی کے ساتھ کرتے اور ہندوستان بھر میں بہت کم لوگوں کو اُن کے پلّے کا آدمی سمجھتے۔ نیازمندوں کی ادبی خامیاں پر اندرخانے خواہ اُن غریبوں کو کھا جاتے مگر بیرونی معرکوں میں مرشد کا طاقتور قلم اُن کی ڈھال بن جاتا۔ اپنے ساتھ بیدل۔ نظیری۔ ظہوری۔ فغانی وغیرہ کو بھی دوست کی کمک پر لے آتے۔ دوستوں سے وہ کمزوری کی حد تک محبت کرتے تھے۔ افراد و اقدار کے بارے میں اُن کے جمے ہوئے نظریات و تعصّبات اتنے بھاری پتھر تھے کہ کوئی دوسرا تو کیا، اِن چٹانوں کو وہ خود بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے۔ سنگاپور میں وہ اپنے لاہور کے بعض ایسے

جگری دوستوں کا تذکرہ اکثر بڑے فخر کے ساتھ کیا کرتے تھے جن میں سے ایک دودھ دہی کی دکان کرتا تھا۔ ایک لوہے کے نمکے نمکیں بیچتا تھا اور ایک حسرت صاحب سے دوستی کے علاوہ بہرے سے کوئی کام ہی نہ کرتا تھا۔

وہ جب اُن کی بے غرض محبت، بے ریا خلوص، بے لوث وابستگی میں اپنے حسنِ بیان کا جادو جگاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ جیسے ناولوں کے ہیرو تھے جو کتابوں سے نکل کر لاہور کے گلی کوچوں میں چلے آئے تھے۔ بعض اوقات مرشد عشرت و آسودگی کے اس ماحول میں، جو وہاں انھیں میسر تھا ان دوستوں کی یاد میں تڑپ اُٹھتے، مغموم ہو جاتے اور ملازمت ترک کر دینے کے منصوبے سوچنے لگتے۔ اُن کے ایک عزیز دوست ریاض شمیم (اب لفٹیننٹ کرنل) جب اتفاقاً تبدیل ہو کر سنگاپور آ گئے تو مرشد اس قدر خوش ہوئے کہ اس طرح بے تحاشا خوش ہوتے ہم نے انھیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں بھر ملنے والے سے ریاض شمیم ہی کا تذکرہ چلتا رہا۔

"مولانا، سُنا آپ نے۔ ریاض شمیم بھی یہیں آ گئے"

"میں دہلی میں تھا تو وہ دانا سے بدل کر دہلی آ گیا، پھر کلکتے، اور اب میرے پیچھے پیچھے یہاں بھی"

"آپ ریاض شمیم سے ملے ہیں؟ ——— ضرور ملیے گا ——— حسین بھی ہے ذہین بھی ہے"

اُن کا سینہ یقیناً آرزوؤں اور ارادوں کا تلاطم زار ہو گا مگر وُہ اپنی آرزوؤں اور محرومیوں کی کتھا سے دوسروں کو کبھی مکدّر نہ کرتے تھے۔ وُہ زندگی کے ہر رُوپ کو ایک انعام، ایک فیضان سمجھتے تھے۔ بہر حال جن دو ایک آرزوؤں کی بہ آوازِ بلند پرورش کیا کرتے رہتے تھے اُن میں سے ایک سِلسلہ دار آرزو یہ تھی کہ دریا کے کنارے ایک معقول سا گھر ہو، ڈھنگ کی لائبریری ہو، جس میں بیٹھ کر وہ سمرنا سے بغداد، بغداد سے سمرنا تک کی تاریخ لکھتے رہیں۔ اور چند یار جانی ہوں جن کے ساتھ شام کو ہاؤ ہُو رہے غالباً یہ تنہا آرزو ہے جس کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے عملی اقدام بھی کیا تھا۔ لوپچھ میں دریا کے کنارے ایک مکان بنوا لیا تھا، کتابوں کا خاصہ ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ حالات اور زندگی نے اُنھیں وہ کام نہ کرنے دیا جو صرف وہی کر سکتے تھے۔

لاہور شہر اور اُس کی زندگی سے مُرشد کو عشق تھا ——— سنگاپور کہ جنوب مشرقی ایشیا کا پیرس سمجھا جاتا ہے، بڑا ہی جمیل و تابناک شہر ہے۔

جنگ کے بعد فتح کی مسرتوں نے اُن دنوں اس کو کچھ اور زیادہ پیرس بنا رکھا تھا۔ شراب وافر تھی، وقت اپنا تھا۔ غالب نے جو بات آم کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس خطّے کے زہرہ شمائلوں پر صادق آتی تھی کہ عام بھی تھے اور شیریں بھی۔ آباد میخانے، شاداب رقص گاہیں، خوابگوں ساحل، گاتے ہوئے کیبرے، جگمگاتے ہوئے کلب، معمور ریستوران، ہیپی ورلڈ گریٹ ورلڈ کے طرب خانے، آزادی، فرصت، فراغت، مرشد کو اور کیا چاہیے تھا؟ انھیں اس شہر سے یک گونہ لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سنگاپور نے انھیں زندگی کے وہ ایسے بہترین اور عہد آفرین سال دیے تھے کہ ہر برس کے تھے دن پچاس ہزار۔ مگر اس کے باوجود سوادِ رو دشتہ الکبریٰ میں انھیں اپنی ولی یعنی لاہور کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح اُن کے ساتھ لگا رہا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں جب وہ لاہور کی یاد سے غافل ہوئے ہوں۔

"مولانا یہ شہر بکواس ہے"

"مولانا اس شہر کی اپنی کوئی شخصیت نہیں"

"مولانا سنگاپور کو آپ اٹھا کر فرانس میں بھی رکھ سکتے ہیں"

اور لاہور کے فضائل ہیں:

مولانا لاہور بجلی کا بٹن دبانے سے نہیں بن گیا"

"مولانا لاہور ایک تہذیب، ایک وضع کا نام ہے"

"مولانا، لاہور، لاہور ہے"

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دعوت میں مرشد ایک مینجر سیٹھی سے اتنی سی بات پر سچ مچ لڑ پڑے تھے کہ سیٹھی کے والد لاہور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ جا بسے تھے۔

مرشد کی رندمشربی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نہ اتنی معمولی چیز ہے کہ میرے چھپائے چھپ سکے۔ وہ خرابی کے پورے معنوں میں رندِ خرابات تھے۔ انھیں سگرٹ، کتاب، شراب سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ انھیں اس طرح دیکھنا غلط بھی ہو گا۔ پینے کے معاملے میں وہ شاعری کے روایتی بلانوش کی طرح دریا سمیٹ کر پی جاتے تھے۔ جتنی پیتے جاتے حواس اتنے ہی روشن ہوتے جاتے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ اُن کے بہکنے کا آسانی سے پتہ بھی تو نہیں چل سکتا تھا۔ آنکھیں عموماً ویسے ہی سرخ و مست رہتی تھیں۔ ہائے وہ یوں کب جانتے تھے کہ کھونے جانے

کا سراغ مِل سکے۔ اگر کوئی ٹوکتا کہ مولٰنا آپ شاید بہک گئے ہیں تو جواب ملتا۔ مولٰنا آپ بہک گئے ہیں۔ میرا تو ہر دامن بھی ابھی تر نہیں ہوا۔ پھر ہوش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تین چار ساغر پے بہ پے خالی کر جاتے۔ اُن کا بہکنا اگر کچھ تھا بھی تو ایک نہایت معصوم سا، بڑا علمی قسم کا بہکنا تھا۔ طنز نوکیلا ہو جاتا، لطیفے بھرپور ہو جاتے، اشعار کی روانی طغیانی پر آجاتی۔ معصیت و بخشش کے مضامین زور باندھ دیتے۔ جن اشعار کو وہ پہلے پینے کا عنوان بناتے تھے انھیں اشعار کو بعد میں رونے کا سامان بنا لیتے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے یہ علامت مقرر کر چھوڑی تھی کہ مرشد جس وقت لاہور یا سالک صاحب کے موضوع پر بلاوجہ ہی دوسروں سے اُلجھنے لگیں تو یہ سمجھیے کہ وہ بہک گئے۔ اس مرحلہ پر وہ خان صاحب کو ہزار آوازیں دیتے خان صاحب قریب نہ پھٹکتے۔

مرشد ہر شام کو جس فراوانی سے پیتے، جس باقاعدگی سے رات کو "شگفتنِ گلہائے ناز" کی سیر کو نکلتے اور پھر جس یک سُوئی کے ساتھ ان نظاروں میں اُلجھ کر رہ جاتے تھے، اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ انھیں اپنے گھربار، بیوی بچے کا بھی کچھ خیال ہو گا، ایک زیادتی کی بات

تھی۔ بظاہر اُن کی وارفتگی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ :

دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

لیکن یہ سب قیاس ہی قیاس تھا مرشد کی شخصیت کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہی ہے کہ وُہ اندر ہی اندر ایک نہایت جمے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے۔ بڑے شفیق باپ، نہایت رقیق القلب شوہر۔ اپنی ساری ماورائیت کے باوصف اُن کا دِل ہر وقت لاہور یا لوپھڑ میں اپنے بیوی بچے کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا ——— گھر سے خط آنے میں دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ جوابی تاروں کا سلسلہ باندھ دیتے۔

بازار کی خرید و فروخت سے انھیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ اُن کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ خریدا کرتے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے ظہیر کو اتنے لمبے لمبے اور پیارے پیارے خط لکھتے کہ اگر اتنا وقت مستقل تصنیف کی طرف دیا ہوتا تو وہ "بغداد سے سمرنا" تک والی تاریخ لکھ ڈالتے

——— ایک مرتبہ آپ وہاں ذرا ایک ——— باقاعدہ عشق میں

مبتلا ہو کر عقدِ ثانی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مہینوں تک وہ دو ہوتی رہی سینکڑوں ڈالر کے تحائف لڑکی والوں کی نذر کر دیے۔ مگر جب عقد کی ساعت قریب آئی تو ظہیر یاد آگیا — زینب یاد آگئی — پونچھ یاد آگیا — اور آخر شش اپنے ہونے والے معزز خسر کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ مولانا مجھے معاف کر دو — مجھ پر لعنت بھیجو — مجھے بھول جاؤ!

مرشد کی گشتِ شبینہ کا انداز بھی کچھ اپنا ہی تھا۔ مغربی موسیقی سے انھیں ہول آتا تھا۔ فلم دیکھنے کو وہ تضیعِ اوقات سمجھتے۔ البتہ چینی ملائی، اانڈونیشی اوپیروں کو شوق سے دیکھتے۔ لیکن کسی ایک مقام پر دیر تک بیٹھے رہنا اُن کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی ابتدائی گیت پر یا منظر پر خوش بھی ہو لیتے؛ سر بھی ہلا دیا، ساتھ ساتھ کلچر کی بحث بھی اٹھاتے رہے مگر پھر دس پندرہ منٹ کے بعد اکتا بھی گئے۔

"مولانا یہ تو بکواس ہے — آئیے کہیں اور چلتے ہیں"

اس کے بعد کہیں اور — پھر کہیں اور — اور جب تک شہر کا آخری اوپرا بند نہ ہو جاتا یہ کہیں اور کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ریستورانوں

میں بیٹھنے کا بھی یہی ہنجار تھا۔ ایک سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں۔ کہیں دومنٹ کو بیٹھ جاتے، کہیں بس جھانک کر لوٹ آتے۔ کہیں لوگ بہت زیادہ ہوتے کہیں بہت کم ہوتے۔ ہر رات تقریباً سارا شہر گھوم کر لوٹتے۔ وہ تھوڑی سی مُہلت میں بہت کچھ دیکھ لینا چاہتے تھے، کیسی بھی جگہ ہو، ایک مقام سے بہت جلد اُن کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے بھی شاید اسی لیے وہ بہت جلد اُکتا گئے۔

سیر و سفر میں کبھی کبھار وہ بے مقصد و بے اختیار سے ہو کر ——— جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ ——— گھومنے کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے

"مولٰنا ان پنی تلی شاہراہوں میں دھرا ہی کیا ہے"

"مولٰنا زندگی بڑی بیکراں چیز ہے"

"مولٰنا زندگی کو آگے پیچھے شمال جنوب ہر طرف سے دیکھنا چاہیئے"

"مولٰنا آئیے آج ہم اپنے آپ کو شہر پر چھوڑ دیں"

اور اپنے آپ کو شہر پر چھوڑنے کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حسرت صاحب جو صبح کی سیر میں بھی پیدل نہ چلتے تھے، گھنٹوں شہر کے والان در والان قسم

کے عقبی کوچوں میں مارے مارے پھرتے۔ ایک مرتبہ اپنے آپ کو بجز یرے پر "چھوڑتے چھوڑتے" ہم ایک ایسے ساحلی کمپونگ یعنی گاؤں میں جا نکلے جہاں تک پہنچنے سے پہلے ایک وسیع و طویل دلدل کے اوپر ننگ تختوں کے ایک جھولتے لرزتے "پُل صراط" پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جن لوگوں نے مرشد کو دیکھا ہے وہ اُن کی مصیبت کا اندازہ کر سکتے ہیں مگر زندگی کو آگے پیچھے سے دیکھنے کے ولولے میں وہ اس "پُل صراط" پر سے بھی گذر گئے!

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انھیں دنوں مرشد کے دوست مشہور ادیب پروفیسر احمد علی ہندوستان سے چین جا رہے تھے۔ اُن کا جہاز شب کے چند گھنٹوں کے لیے سنگاپور میں رُک رہا تھا۔ مرشد ایک مدت سے اُن کی راہ تک رہے تھے اور اُن کے چند گھنٹوں کے قیام کو پُرلطف بنانے کے لیے کوئی پورے تین شب و روز کی مصروفیت طے کر چھوڑی تھی۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ جب شام احمد علی وہاں پہنچے ہیں، مرشد کو سو کر جاگنے، جاگ کر اُٹھنے، اُٹھ کر تیار ہونے اور پھر دو تین ساغر برائے ملاقات پینے میں اتنی دیر ہو گئی کہ جب ہم لوگ جہاز پر پہنچے تو پروفیسر صاحب شہر کی گشت پر نکل چکے تھے۔ اب انھیں ڈھونڈھنے

کام حملہ شروع ہوا۔ جاوید نے کہا کہ اتنے بڑے اجنبی، پُر اسرار شہر میں اندھادھند تلاش سے کون مل سکتا ہے۔ لیکن مرشد بہت پُر امید تھے۔ فرمایا —— "کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے احمد علی کو کہاں ہونا چاہیئے۔ میرے بھائی میں احمد علی کو جانتا ہوں" ——

تلاش شروع ہوئی تو احمد علی کو جہاں جہاں ہونا چاہیئے تھا، ایک ایک مقام چھان مارا مگر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب مرشد یہ کہہ کر کہ ذرا تازہ دم ہو کر ابھی پھر نکلتے ہیں، ایک چینی ریسٹورنٹ میں گھس گئے اور وہاں جام و مینا سے نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوئیں کہ خیالات کا دھارا احمد علی کو پاسکنے کی رجائیت کی طرف سے یک بارگی احمد علی کو نہ پاسکنے کی قنوطیت کی طرف مڑ گیا۔ بولے:

"مولانا یہ احمد علی تو ملتا دکھائی نہیں دیتا"

"کیوں؟" —— ہم نے پوچھا۔

"مولانا چینیوں کے اس شہر میں احمد علی کا ملنا ناممکن ہے۔ بات یہ ہے کہ سامنے کے رُخ سے احمد علی بھی ساٹھ فی صدی چینی معلوم ہوتا ہے اور چینیوں کے

کے انبوہ میں کسی چینی سے آپ خط و کتابت تو کر سکتے

ہیں اُسے شناخت نہیں کر سکتے ——— اب اس

کو جہاز پر ہی پکڑیں گے۔"

پھر وہیں بیٹھے بیٹھے مرشد نے محمد احمد علی کی باتیں شروع کی ہیں کہ وہ کتنا پیارا آدمی ہے، کتنا نادر ادیب ہے، کتنا قیمتی دوست ہے تو درمیان میں ہماری وقفہ بہ وقفہ یاد دہانیوں کے بعد جب ریستوران سے اُٹھ کر آخر جہاز پر پہنچے تو جہاز ہانگ کانگ کو روانہ ہو چکا تھا۔ بعد میں خط و کتابت سے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی اُس شب اپنے آپ کو سنگاپور پر چھوڑ رکھا تھا۔

مرشد کو کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے۔ تاہم ادب کی طرح کھانے کا بڑا ہی کلاسیکی مذاق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی، کھانے کی صورت بُری ہوتی تو اُس پر بھڑک اُٹھتے۔ طبیعت منغض ہو جاتی۔ اشتہا مر جاتی۔ کھانا کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابانِ اودھ، سلاطینِ کشمیر اور قطب شاہی علی قلی خانوں کے مطبخوں، دسترخوانوں کے متعلق بڑی وسیع ذاتی معلومات رکھتے تھے۔

ان معلومات نے مرشد کو اس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنا دیا تھا۔ ذائقے اور تنوع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے تھے۔ شب دیگ، گوشتابہ، یخنی، آفتابہ وغیرہ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ بارہا مرشد نے شب دیگ خود اپنے ہاتھ سے دم کرنے کا پروگرام بنایا لیکن دیگ میسر آسکی نہ شب ایک مرتبہ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورسوں کے ڈنر سے سابقہ پڑا جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین، شیریں مچھلی تل کر سامنے رکھ دی تھی تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے مگر قیادت کا جھنڈا پھر بھی کشمیر ہی میں لہراتا رہا۔

دو سال کے بعد مرشد ۵ فروری ۱۹۴۷ء کو ہم سے رخصت ہوئے احباب کا ایک ہجوم الوداع کہنے کو ساحل پر موجود تھا۔ جس میں فوجی افسر، سردار، سپاہی سبھی شامل تھے۔ مقامی طاقتوں کا بھی ایک جم غفیر پہنچا ہوا تھا۔ ملائی معززین، عرب سوداگر، چینی آرٹسٹ اور اپنی ورلڈ۔ اور گریٹ ورلڈ کے خدمت گار ایک اجنبی کو رخصت کر رہے تھے۔ ان میں بہت تھوڑے تھے جو ادیب چراغ حسن حسرت کی عظمت سے واقف تھے۔ ان

سنگاپور کا نیچر حسرت

لوگوں کو انسان نہ چراغ حسن حسرت کی محبت جزیرے کے کونے کونے سے کھینچ لائی تھی۔ ہم سے ہمارا مرشد جدا ہو رہا تھا۔ سپاہی ایک ایسے افسر کو رخصت کر رہے تھے جو افسروں کی نوع ہی سے مختلف تھا۔ مقامی احباب اُس شخص کو الوداع کہہ رہے تھے جس سے مل کر وہ ایشیا کے ایک عظیم ملک کی روح میں جھانک سکے تھے ہیپی ورلڈ کے خدمت گار اُس محسن سے محروم ہو رہے تھے جو چائے پیے بغیر بھی بڑی باقاعدگی، بڑی فیاضی سے اُن کو ٹپ دیتا تھا اور جب عظیم "ڈیربن شائر" لنگر اُٹھا کر آبنائے ملاکا کے کھلے پانیوں کی طرف رینگنے لگا تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے وہ دو سال ہماری پوری زندگی پر پھیل گئے ہوں۔ جذبات کے ایک مشترکہ جھٹکے سے ہر دل بوجھل، ہر آنکھ نمناک ہو گئی مگر جو شخص بچوں کی طرح بلبلا کر رو پڑا وہ مرشد کا اردلی علامہ عنایت اللہ تھا جو مرشد کو بچوں کی طرح پالتا رہا تھا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

○

کتبہ خورشید احمد خوشنویس